کوڈ: 1970

یونٹ: 01 تا 09

منتخب قرآنی موضوعات

برائے بی ایس علوم اسلامیہ

(تخصص قرآن وتفسیر)

شعبہ قرآن وتفسیر

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کوڈ نمبر:1970 یونٹ نمبر:01–09

منتخب قرآنی موضوعات

برائے بی ایس علوم اسلامیہ

(تخصص قرآن و تفسیر)

شعبہ قرآن تفسیر

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ایڈیشن :	اول
سال اشاعت:	2024ء
تعداد اشاعت:	1000
نگران طباعت:	ڈاکٹر سرمد اقبال
طابع:	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
ناشر:	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس ٹیم

سرپرست : پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی
ڈین کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ ،AIOU، اسلام آباد

چیئرمین : ڈاکٹر ثناء اللہ حسین
چیئرمین شعبہ قرآن و تفسیر ،AIOU، اسلام آباد

جمع وترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ قرآن و تفسیر ،AIOU، اسلام آباد

نظر ثانی: ڈاکٹر محمد طیب خان
لیکچرر شعبہ قرآن و تفسیر ،AIOU، اسلام آباد

کورس رابطہ کار: ڈاکٹر ظفر اقبال
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ قرآن و تفسیر ،AIOU، اسلام آباد

کمپوزنگ: اسد اقبال اعوان
سٹینو ٹائپسٹ شعبہ قرآن و تفسیر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ،اسلام آباد

فارمیٹنگ ،لے آؤٹ مشتاق حسین

فہرست عنوانات

نمبر نام یونٹ صفحہ نمبر

یونٹ نمبر: 01 قرآن مجید اور عقیدہ توحید 09
یونٹ نمبر: 02 قرآن مجید اور عقیدہ رسالت 23
یونٹ نمبر: 03 قرآن مجید اور عقیدہ آخرت 35
یونٹ نمبر: 04 قرآن مجید اور عبادات 49
یونٹ نمبر: 05 قرآن کریم اور اسوہ حسنہ 69
یونٹ نمبر: 06 قرآنی شخصیات 85
یونٹ نمبر: 07 ارض القرآن 113
یونٹ نمبر: 08 قرآن کریم اور نظریہ تخلیق کائنات 129
یونٹ نمبر: 09 قرآن مجید اور معاملات وتدبیر منزل 151

پیش لفظ

علوم اسلامیہ کا بنیادی ماخذ و مصدر قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید امت مسلمہ کے لیے بالخصوص اور انسانیت کے لئے بالعموم کتاب رشد و ہدایت ہے۔ اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس کی آیات کی صحیح تفسیر و تعبیر کا علم نہایت ضروری ہے۔ جو ایک علمی خزانہ کے طور پر علماء امت کی معتبر کتب میں موجود ہے۔ ایمان لانے کے بعد کسی بھی مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اسلام کے بنیادی عقائد اور نظریات کا کماحقہ علم ہو۔ قرآن مجید چونکہ مذہب اسلام کا بنیادی ترین ماخذ ہے۔ لہٰذا علوم اسلامیہ کے طلبہ کو قرآن کے مکمل ڈھانچے اور موضوعات و نظریات کا خاکہ کا علم انتہائی ضروری ہے۔

شعبہ قرآن و تفسیر میں بی ایس سے /پی ایچ ڈی تک کی سطح کے کورسز پیش کئے جارہے ہیں۔ یہ کورسز قرآنیات کے میدان میں بیسیوں جہتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ جن میں علوم القرآن اصول تفسیر، مناہج تفاسیر، قرآنی عربی، فقہ القرآن، تفسیری متن، مقدمات تفاسیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کتاب ھذا 'منتخب قرآنی موضوعات'، کوڈ 1970 بطور خاص بی ایس علوم اسلامیہ، تخصص قرآن و تفسیر کے طلبہ کے لیئے مرتب کی گئی ہے۔ جو تفاسیر، کتب حدیث، کتب سیرت و تاریخ اور دسیوں موضوعات قرآنی سے متعلق کتب جیسے ارض القرآن، قرآنی شخصیات وغیرہ سے مواد جمع کر کے مرتب کی گئی ہے۔ اور قرآنیات کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کتاب کی تکمیل پر شعبہ کے چیئرمین ڈاکٹر ثناء اللہ حسین اور مرتب ڈاکٹر ظفر اقبال مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ کریم ان کی اس کاوش کو قبولیت کا درجہ عطا فرمائے۔ اور قارئین کے لئے مفید ثابت فرمائے۔

ڈاکٹر شاہ محی الدین ہاشمی
ڈین کلیہ عربی علوم اسلامیہ

دیباچہ

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے۔اس کے عجائب رہتی دنیاتک منصۂ شہود پر آتے رہیں گے۔قرآن مجید علوم کا خزینہ ہے۔قرآن مجید میں جہاں احکام ذکر ہوئے ہیں وہاں قرآن مجید کی آیات کا ایک بڑا حصہ اسلام کے بنیادی عقائد، قوموں کے حالات وانجام، انبیاء اکرام کے قصص، معاشی ومعاشرتی نظامات کو بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔قرآنی موضوعات کے نام سے بہت زیادہ کتب لکھی جاچکی ہیں۔ موضوع کی گہرائی اور گیرائی کی وجہ سے کوئی ایک کتاب اس کا احاطہ نہیں کرسکتی۔کتاب ھذا بھی اسی سلسلہ کی ایک کاوش ہے جو بطور درسی کتاب کے مرتب کی گئی ہے۔

کورس ھذا 'منتخب قرآنی موضوعات'، کوڈ 1970 بی ایس علوم اسلامیہ تخصص قرآن و تفسیر کے طلبہ کے لئے تیار کیا گیا ہے جس میں بہت ہی دل پذیر پیرائے میں قرآنی موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ شعبہ کے اسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے دن رات محنت کر کے موضوعات قرآن کے موضوع پر اہم اور قابل قدر مواد کو ترتیب دیا ہے۔ بحیثیت چیئرمین شعبہ میرے لیے بے حد مسرت کا مقام ہے کہ شعبہ کی کتب میں ایک اہم اضافہ ہوا ہے۔امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب نہ صرف بی ایس قرآن و تفسیر کے طلبہ بلکہ عامۃالناس کے لیے بھی انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر ثناء اللہ حسین
چیئرمین شعبہ قرآن و تفسیر

تعارف

کورس 'منتخب قرآنی موضوعات'، کوڈ 1970 شعبہ قرآن و تفسیر کی طرف سے بی ایس علوم اسلامیہ تخصص قرآن تفسیر کے طلبہ کے لیے بالخصوص اور یونیورسٹی کے دیگر طلبہ کے لیے بالعموم پیش کیا جارہا ہے۔ 'منتخب قرآنی موضوعات' میں اسلام کے بنیادی عقائد ثلاثہ، اسوہ حسنہ، قرآنی شخصیات، مقامات قرآنی، نظریہ عبادت، تخلیق کائنات اور تدبیر منزل و معاملات کے قرآنی نظریات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ کتاب کو مذکورہ بالا عنوانات کی مناسبت سے نو یونٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر یونٹ میں متعلقہ عنوان سے متعلق قرآنی آیات مبارکہ کو پیش کرنے کے بعد ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کو بنیادی مصادر سے پیش کیا گیا ہے۔ موضوعات کی تفصیل نہ صرف تفاسیر بلکہ حدیث و سیرت، تاریخ اور دیگر کتب موضوعات قرآنی جیسے ارض القرآن، قرآنی شخصیات وغیر اہم کتب سے دی گئی ہے۔ ہر یونٹ میں بیان کردہ موضوعات جن کے حوالہ سے قرآن مجید میں اصولی رہنمائی پائی جاتی ہے، کو واضح کیا گیا ہے۔ موضوعات قرآنی پر یوں تو سینکڑوں کتب موجود ہیں لیکن کورس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اختصار اور جامعیت کے ساتھ کتاب ھذا میں مواد کو جمع و ترتیب دیا گیا ہے۔ تاکہ علمی ضرورت کے ساتھ ساتھ امتحانی ضرورت بھی پوری ہو سکے۔

کتاب ھذا میں اس تفصیل سے بقدر ضرورت منتخب مباحث کو قرآنی آیات کے ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب امت مسلمہ کے لیے بطور خاص نظریاتی میدان میں بہترین رہنمائی کا سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ فوری اور مختصر ریفرنس کے طور پر موجود ہو گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب ہمارے لئے نہ صرف دنیا میں احکام پر عمل کرنے کے لیئے رہنما ثابت ہو بلکہ آخرت میں باعث اجر و ثواب ہو آمین۔

ڈاکٹر ظفر اقبال
اسٹنٹ پروفیسر شعبہ قرآن و تفسیر

کورس کے مقاصد

اس کورس کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ قرآن مجید کی روشنی میں اسلام کے بنیادی عقائد کو بیان کر سکیں۔

2۔ قرآنی شخصیات، مقامات قرآنی، قرآن کا نظریہ تخلیق کائنات بیان کر سکیں۔

3۔ قرآن میں بیان اسوۂ حسنہ کو بیان کر سکیں۔

4۔ قرآن کی روشنی میں معاملات اور تدبیر منزل کے نظریات کو بیان کر سکیں۔

اس کورس میں طلباء کے لئے زیادہ سے زیاد مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔تاہم طالب علموں سے امید ہے کہ وہ مزید مطالعہ کے لئے قرآنی موضوعات سے متعلق دوسری کتابوں سے بھی رجوع ضرور کریں گے جن کا ذکر ہر یونٹ کے آخر میں بطور حوالہ جات میں ہے۔

اس کورس کے مطالعہ سے آپ قرآنی موضوعات کے اہم موضوعات سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کے علم و عمل میں برکت نصیب فرمائے۔

یونٹ نمبر: 01

قرآن مجید اور عقیدہ توحید

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 11
یونٹ کے مقاصد 11
قرآن مجید اور عقیدہ توحید 12
لغوی معنی 12
شرعی معنی 12
توحید کی اقسام 13
عقیدۂ توحید انبیاء کا اولین پیغام 17
عقیدۂ توحید انسان کا مقصدِ وجود 18
قرآن مجید کی ابتداء وانتہا عقیدۂ توحید 19
خود آزمائی 22

یونٹ کا تعارف

عقیدہ توحید اسلام کی اساس ہے۔ قرآن مجید میں کثرت سے ایسی آیات ملتی ہیں جن میں عقیدہ توحید کو واضح الفاظ میں جزئیات و امثال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے. اس یونٹ میں توحید کا مفہوم،اقسام، شرک کی صورتیں،اورانسان کے لیے نجات میں عقیدہ توحید کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ توحید کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم جان سکیں۔

2۔ توحید کی اقسام جان سکیں۔

3۔ شرک کی صورتیں جان سکیں۔

4۔ انسان کے لیے عقیدہ توحید کی اہمیت جان سکیں۔

قرآن مجید اور عقیدہ توحید

توحید دین اسلام کی بنیاد ہے، توحید سب سے پہلا فرض ہے جس کا اقرار کرنا اور اسے دل وجان سے قبول کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے، توحید وہ چیز ہے جس کے بغیر کوئی انسان دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا، توحید ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگیں ہوتی رہیں اور ان گنت مسلمانوں نے اس کے لیے اپنی جانوں کو قربان کر کے جام شہادت نوش فرمایا، توحید ہی وہ اساسی فریضۂ دین ہے جو اسلام اور کفر کے درمیان فرق کرتا ہے، توحید ہی وہ چیز ہے کہ اگر اسے کماحقہ قبول کر لیا جائے اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا جائے اور اسی پر موت آجائے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے اور اگر اسے کماحقہ قبول نہ کیا جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی وعید سنائی ہے اور اسے قبول نہ کرنے والے انسان پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔

جب انسان کی نجات اور کامیابی وکامرانی کے لیے عقیدۂ توحید اس قدر اہم ہے تو سب سے پہلے ہم یہ جانیں گے کہ عقیدۂ توحید کیا ہے؟

کتاب اللہ اور احادیث نبوی میں عقیدۂ توحید جن چھ چیزوں پر مشتمل ہے انہی چھ اسلامی بنیادی عقائد کو آپ ارکان ایمان کے نام سے جانتے ہیں۔

آمنت بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر والقدر خيره وشره من الله تعالي والبعث بعد الموت۔

۱: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا، ۲: اس کے فرشتوں پر ایمان لانا، ۳: اس کی کتابوں پر ایمان لانا، ۴: اس کے رسولوں پر ایمان لانا، ۵: قیامت کے دن پر ایمان لانا، ۶: اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لانا۔اسی طرح مر کر دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان ہو، اسی کو آخرت کے دن پر ایمان رکھنا کہا جاتا ہے۔تو عقیدۂ توحید ان چھ ارکان میں سے پہلے رکن سے تعلق رکھتا ہے۔

عزیز طلبہ! اب عقیدۂ توحید کا معنیٰ ومفہوم جانیں گے۔

لغوی معنی:

کسی چیز کو ایک جاننا ایک ماننا۔

شرعی معنی:

اللہ کو اس کے افعال، عبادات اور اس کے اسماء وصفات میں اکیلا اور یکتا ماننا۔

مفہوم:

اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں واحد، اکیلا اور لاثانی ہے اس کی صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں، تمام کائنات کو پیدا کرنے والا صرف ایک اللہ ہے، اس کے سامنے ساری مخلوق اور دنیا کی طاقتیں ہیچ ہیں، زندگی و موت، صحت و بیماری، نفع نقصان سب اس کے اختیار میں ہے، کسی مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

یاد رکھیں! توحید یہ نہیں ہے کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق و مالک سمجھیں تو بس کافی ہو گیا ہر گز نہیں۔ بلکہ توحید تو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک بندہ اللہ تعالیٰ کو اس کے افعال، عبادات اور واسماء و صفات میں اکیلا نہ مان لے۔

عزیز طلبہ! الحمد للہ ہم نے توحید کی تعریف جان لی لیکن اس کی قسمیں کیا ہیں اور کتنی ہیں یہ جاننا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم توحید کے اصل مفہوم کو سمجھ نہیں پائیں گے۔

توحید کی اقسام

ا۔ توحید الوہیت، ۲۔ توحید ربوبیت، ۳۔ توحید اسماء و صفات

پہلی قسم: توحید الوہیت

اس سے مراد یہ ہے کہ عبادات میں اللہ تعالیٰ کو یکتا مانا جائے، اور تمام قسم کی عبادات صرف اسی کے لیے انجام دی جائیں۔ مثلاً، رکوع، سجدہ، قربانی، نذر و نیاز، دعا، مصیبت کے وقت صرف اور صرف اسی سے مدد طلب کرنا، اسی سے امیدیں وابستہ رکھنا، اسی کو مشکل کشا اور حاجت روا تسلیم کرنا، ہر چیز اسی سے مانگنا حتیٰ کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اسی سے مانگنا، بندہ کو نمک کی بھی ضرورت پیش آئے تو وہ بھی اسی سے طلب کرنا ہے۔

الغرض ہر قسم کی عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے بجالائے اور غیر اللہ کی محبت کو دل سے نکال کر صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کو اپنے دل میں بسائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{ قُلْ انَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ للّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ } [الانعام: ۱۶۲]

"آپ کہئے کہ میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے"

اب اگر کوئی شخص وہ تمام کام جو اللہ کے لیے سرانجام دیئے جاتے ہیں ان میں سے کوئی بھی کام غیر اللہ کے لیے کرے، رکوع، سجدہ، قربانی، نذر و نیاز وغیرہ تو اس نے بہت بڑا شرک کیا اور جب تک وہ ایسا کرتا رہے گا اس

کی کوئی نیکی قبول نہیں ہو گی اور اگر اسی حالت میں بغیر توبہ کیے وہ مر گیا تو وہ ہمیشہ کا جہنمی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اپنے اکیلے معبود برحق ہونے کا اعلان کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں۔

{وَالٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِيْم} [البقرۃ: ۱۶۳]

''تم سب کا معبود ایک ہی مَعبوَد ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے''

{فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا} [الحج: ۳۴]

''تمہارا معبوَد ایک ہی معبود ہے پس تم سب اسی کے فرمانبردار بن جاؤ''

{اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ} [الصف: ۴]

''بے شک تمہارا معبود ایک ہی ہے''

{وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا} [النساء: ۶]

''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ''

{فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ} [الشعراء: ۲۱۳]

''پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود سمجھ کر مت پکاریں اگر (بالفرض) آپ نے بھی ایسا کیا تو آپ کو بھی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا''

نوٹ: اس آیت میں شرک کی برائی کو واضح کیا گیا ہے، ورنہ کسی نبی سے شرک کا ارتکاب ناممکن ہے یہ بتایا گیا کہ اگر بفرض محال کسی نبی سے بھی شرک کا ارتکاب ہو جائے تو اس کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح احادیث نبوی میں بے شمار دلائل موجود ہیں۔

عَنْ عُثْمَانَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ''مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، دَخَلَ الْجَنَّةَ'' [صحیح مسلم: ۲۶]

عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی الٰہ نہیں (یعنی عقیدۂ توحید کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اسی عقیدہ پر موت تک قائم رہا) تو وہ شخص جنت میں داخل ہو گا''

عَنْ جَابِرٍ ،قَالَ أَتَى النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ مَا الْمُوجِبَتَانِ فَقَالَ:'' مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ'' [صحیح مسلم: ۹۳]

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اس نے آکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کون سی دو چیزیں ہیں جو واجب کر دینے والی ہیں (ایک چیز جنت کو واجب کرنے والی اور ایک چیز جہنم کو واجب کر دینے والی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا تھا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا کرتا تھا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا''

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قال سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَقُولُ:'' مَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ النَّارَ''[صحیح مسلم:۲۹]

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے فرمایا: ''جس شخص نے یہ گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں تو اللہ نے اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دیا''

دوسری قسم: توحید ربوبیت

یعنی ہم اس بات پر ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا تنہا خالق ہے، مالک ہے، مدبر ہے۔ تمام امور جیسے رزق عطا کرنا، زندہ کرنا، مارنا اور بارش نازل کرنا وغیرہ کی تدبیر کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

{اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ} [الروم:۴۰]

''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو مارے گا پھر تم کو زندہ کرے گا کیا تمہارے شریکوں میں سے (وہ جن کو تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ پکارتے ہو) کوئی ایسا ہے جو یہ کام (پیدا کرنا، رزق دینا، مارنا اور زندہ کرنا) کر سکتا ہو اللہ تعالیٰ پاک اور بلند ہے ان شریکوں کی شرکت سے پاک اور بلند ہے جن کو اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہیں''

{وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ} [النحل:۵۳]

''اور تمہارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں سب اللہ کی ہی طرف سے ہیں''

{هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا} [البقرۃ:۲۹]

''وہ اللہ ایسی ذات ہے جس نے ہر اس چیز کو تمہارے لئے پیدا کیا جو زمین میں ہے''

{وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ} [الشعراء: ۸۰]

''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں وہی مجھے شفا دیتا ہے'' (یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہی تھی)

نوٹ: تو ہر مسلمان کا بھی یہی عقیدہ ہونا چاہئے کہ صحت دینے والا، شفا دینے والا، رزق دینے والا، پریشانیوں کو دور کرنے والا، حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے والا، مدد کرنے والا، مشکل کشا، حاجت روا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

تیسری قسم: توحید اسماء و صفات

اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ان اسماء و صفات پر ایمان لائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کیا ہے، اور جنہیں اس کے نبی محمد ﷺ نے ثابت کیا ہے۔ان پر بغیر تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل کے اسی طریقے سے ایمان لایا جائے جیسا اس ذات عزوجل کے لائق ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ} [الاعراف: ۱۸۰]

''اور اللہ کے بہت ہی اچھے اچھے نام ہیں، پس تم لوگ اسے انہی ناموں کے ذریعہ پکارو اور ان لوگوں سے تعلق نہ رکھو جو اس کے ناموں کو بگاڑتے ہیں (اس کے غلط معنی بیان کرتے ہیں) اور انہیں عنقریب ان کے کئے کی سزا دی جائے گی''

قرآن مجید کی ایک مکمل سورت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مشتمل ہے اور اس میں بیک وقت توحید کی تینوں اقسام شامل ہیں۔

{قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ} [الاخلاص: ۱]

''کہہ دو کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے''

لفظ ''الصمد'' پر غور کریں۔اس کا معنی بے نیاز ہے یعنی کہ وہ ذات جس کو کسی کی ضرورت نہیں لیکن سب کو اس کی ضرورت ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

{لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ} [الشوریٰ:۱۱]

''اللہ کے مثل کوئی چیز نہیں، اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے''

اس آیت میں غور فرمائیں کہ اس میں تشبیہ کی نفی کر دی گئی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کو مخلوقات کی صفات سے تشبیہ دینا قطعاً درست نہیں۔اس آیت میں دو صفات کا ذکر ''سمیع، بصیر'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا اور سنتا ہے لیکن اس کا دیکھنا اور سننا اسی طرح ہے جیسا کہ اس کی بڑائی اور کبریائی کے لائق ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات پر بھی ہمارا ایمان ہونا چاہئے۔ لیکن نہ تو تشبیہ اور تمثیل کو جائز تصور کرتے ہیں اور نہ ہی ان صفات کی کیفیت کو جانتے ہیں اور نہ ہی ان کی کیفیت بیان کرنے کو جائز تصور کرتے ہیں کیونکہ کیفیت کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے جب (الرحمن علی العرش استویٰ) کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: ''الإستواء معلوم، والكيف مجهول، والإيمانُ به واجِب، والسؤالُ عنه بدعة'' یعنی، استوی کا معنی معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے لیکن اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے ۔

عزیز طلبہ ! توحید کا معنیٰ و مفہوم اور اس کی اقسام جان لینے کے بعد آیئے اب یہ جانتے ہیں کہ انسانی زندگی میں عقیدۂ توحید کی کیا اہمیت ہے؟

۱: عقیدۂ توحید انبیاء کا اولین پیغام

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو متعدد تعلیمات و ہدایات کے ساتھ مبعوث کیا، اور تمام انبیاء کرام کی اولین دعوت اور سب سے پہلا پیغام و مشن بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی توحید کا اعلان اور تمام معبودان باطلہ سے برأت کا اظہار تھا۔

جیسا کہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

{وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ} [الانبیاء: ۲۵]

''اور ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھی بھیجا، اس پر یہی وحی نازل کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اس لیے تم سب میری ہی عبادت کرو''

کتاب وسنت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم کو سب سے پہلے توحید ہی کی دعوت پیش کی تھی، اور سابقہ تمام انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام ہی کی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی دعوت کا

آغاز عقیدۂ توحید ہی سے کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ} [الاعراف: ۱۵۸]

''آپ کہئے کہ اے لوگو! میں تم سب کے لیے اس اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے''

۲: عقیدۂ توحید انسان کا مقصدِ وجود ہے

توحید نہ صرف انسان کا مقصد وجود ہے بلکہ جنات کو بھی اللہ تعالیٰ نے توحید یعنی صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ} [الذاریات: ۵۶]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''

صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا حقیقی توحید ہے اور اس پر یقین رکھنا عقیدۂ توحید کہلاتا ہے جو ہمارا مقصدِ زندگی ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت میں ''لیعبدون'' کا یہی معنیٰ ہے، لیکن مفسرین نے مزید صراحت کے ساتھ ''لیعبدون'' کا معنی'' لیوحدون '' بتایا ہے یعنی تاکہ وہ میری توحید اختیار کریں۔[فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر للشوکانی]

نہ صرف جنات وانسانوں کا مقصدِ حیات توحید ہے بلکہ ہر چیز توحید میں مصروف ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا} [بنی اسرائیل: ۴۴]

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو مخلوقات ان میں پائے جاتے ہیں سبھی اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور ہر چیز صرف اسی کی حمد و ثنا اور پاکی بیان کرنے میں مشغول ہے لیکن تم لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو، وہ بے شک بڑا بردبار بڑا معاف کرنے والا ہے''

تسبیح کا مطلب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کو بے عیب قرار دینا اور حمد کا معنی اللہ تعالیٰ کو خوبیوں سے متصف قرار دینا

ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک جہاں بہت بڑے عیب کی بات ہے وہیں اللہ تعالیٰ کی توحید بڑی خوبی کی بات ہے اس اعتبار سے ہر مخلوق تسبیح کے ساتھ حمد میں مشغول ہے یعنی توحید کی طرف مائل اور شرک سے دور اور بے زار ہے، واضح رہے کہ اس مفہوم کی جانب امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اشارہ کیا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ رکوع، سجدہ، قیام، دعا، نذر نیاز، قربانی، الغرض کوئی بھی عبادت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے کسی بھی غیر اللہ، پیر، ولی، بابا، مرشد کے لیے خاص کرنا حرام ہے عظیم گناہ ہے۔

{ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ } [لقمان: ۱۳]

"بے شک شرک ظلم عظیم ہے"

یاد رکھیں: اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دوسروں کو شریک ٹھہرانا بہت بڑا ظلم اور بدترین جرم ہے، یہ ایسا بھیانک و گھناؤنا عمل ہے کہ جو شخص شرک میں ملوث رہا اور توبہ کئے بغیر اس کی موت ہو گئی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

۳: قرآن مجید کی ابتداء وانتہا اسی عقیدۂ توحید پر ہے۔

یعنی کہ قرآن کریم میں اقامتِ صلاۃ جیسی عبادات اور توبہ واستغفار جیسے تزکیۂ نفس کے کاموں میں سے پہلے عقائد، ایمانیات اور توحید کا ذکر کیا گیا ہے حتیٰ کہ قرآن مجید کی ہر آیت کا تعلق عقیدۂ توحید سے ہے۔

جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر آیت توحید پر مشتمل، توحید کی شاہد، اور توحید کی طرف دعوت دینے والی ہے، کیونکہ قرآن مجید اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں اور اس کے اسماء حسنیٰ و صفات علیا کے بارے میں ہے تو یہ توحید علمی و خبری ہے، یا اللہ تعالیٰ کی عبادت۔ اور غیر اللہ سے برأت کے بارے میں ہے تو یہ توحید ارادی و طلبی ہے۔

لہٰذا "الحمد للہ" میں توحید، "رب العالمین" میں توحید، "الرحمٰن الرحیم" میں توحید، "مالک یوم الدین" میں توحید، "إیاک نعبد" میں توحید، الغرض قرآن کریم کی ہر آیت توحید پر مشتمل ہے۔

۴: عبادات کی قبولیت کی شرط صحیح عقیدہ وایمان پر منحصر ہے

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا } [بنی اسرائیل: ۱۹]

''اور جو کوئی آخرت چاہتا ہے اور اس کے لیے اس جیسی کوشش کرتا ہے وہ مومن ہوتا ہے تو ان کی کوششوں کا انہیں پورا بدلہ چکایا جائے گا''

اسی طرح صحیح بخاری کی روایت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ ،رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: ''شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ ،وَإِقَامِ الصَّلَاةِ ،وَإِيتَائِ الزَّكَاةِ ،وَالحَجِّ ،وَصَوْمِ رَمَضَانَ''[صحیح بخاری:۸]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے۔اول گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا''

مذکورہ حدیث میں تمام اعمال و عبادات میں توحید ہی کا ذکر مقدم ہے تو پتہ یہ چلا کہ اولین ذکر و شرط توحید ہے اس کے بغیر کوئی بھی عبادت قابل قبول نہیں۔

مثلاً آپ نماز پڑھ رہے ہیں، روزہ رکھ رہے ہیں، حج و عمرہ ادا کر رہے ہیں، صدقات ادا کر رہے ہیں اور تمام اعمال صالحہ میں سبقت لے جا رہے ہیں مگر بندہ کے عقائد میں بگاڑ ہے، اس کا عقیدۂ توحید درست نہیں تو اس کی ساری عبادات و ریاضات، اس کے تمام اعمال و حسنات اکارت و برباد ہو جائیں گے، اس کی کوئی عبادت قابل قبول نہیں۔کیونکہ توحید ہی کی بنا پر عبادات درست اور صحیح قرار دی جاتی ہیں اور اللہ تبارک تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت کا باعث بنتی ہیں۔

جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:

{ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ } [المائدۃ:۵]

''اور جو ایمان لانے سے انکار کرے گا، اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، اور وہ آخرت میں گھاٹا پانے والوں میں سے ہو گا''

اس نکتے کا حاصل یہ ہے کہ نیک عمل اور عبادت کی قبولیت کے لیے توحید و ایمان اولین شرط ہے، اور کفر کی وجہ سے عبادتیں قبول نہیں کی جاتی ہیں، بلکہ کفر کی بنا پر سابقہ عمل بھی برباد ہو جائے گا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کفر و شرک پر قائم رہتے ہوئے کفار و مشرکین کے لیے مساجد کو آباد کرنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس کا اختیار اہل ایمان کو دیا، علاوہ ازیں قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ بفرض محال اگر انبیاء علیہم السلام حتیٰ کہ نبی ﷺ سے بھی اس کا صدور ہوتا تو لازماً ان کا بھی نیک عمل ضائع ہو جاتا۔

۵: عقیدۂ توحید گناہوں کی بخشش واخروی نجات کا ذریعہ

جس طرح عقیدۂ توحید بہترین زندگی اور اعمال کی قبولیت کے لیے شرط ہے اسی طرح اخروی نجات کے لیے بھی انتہائی ضروری ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: فَإِنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، يَبْتَغِي بِذَلِكَ وَجْهَ اللهِ" [صحیح بخاری: ۴۲۵]

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو آگ سے محفوظ کر دیا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر "لاإلہ إلا اللہ" کہا"

اسی عقیدۂ توحید ہی کی بنا پر آسمان بھر گناہ اور زمین بھر خطائیں بھی معاف ہو جاتی ہیں جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَال:سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ،يَقُولُ: قَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى:" يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ فِيكَ وَلَا أُبَالِي،يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أُبَالِي،يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً" [سنن الترمذی: ۳۵۴۰]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ کہتا ہے: "اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعائیں کرتا رہے گا اور مجھ سے اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا، چاہے تیرے گناہ کسی بھی درجے پر پہنچے ہوئے ہوں، مجھے کسی بات کی پرواہ و ڈر نہیں ہے، اے آدم کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان کو چھونے لگیں پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرنے لگے تو میں تجھے بخش دوں گا اور مجھے کسی بات کی پرواہ نہ ہو گی۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو زمین برابر بھی گناہ کر بیٹھے اور پھر مجھ سے (مغفرت طلب کرنے کے لیے) ملے لیکن میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس اس کے برابر مغفرت لے کر آوں گا (اور تجھے بخش دوں گا)"

مذکورہ حدیث سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے ہر گناہ کو معاف کرے گا چاہے اس کے گناہ آسمان و زمین کے برابر کیوں نہ ہو جائیں لیکن شرط ہے کہ بندہ مکمل توحید پر قائم رہے اس کی ذات، وصفات اور عبادات میں کبھی شرک نہ کیا جائے تو یہی توحید انسان کے گناہوں کی بخشش اور، اخروی نجات کا ضامن ہے۔

خلاصہ کلام: توحید تمام احکام میں اولین حکم ہے، تمام عبادات میں مقدم فریضہ توحید ہے، توحید محور حیات ہے، عقیدۂ توحید سب سے افضل نیکی ہے، توحید ایمان کا سب سے افضل شعبہ ہے، توحید افضل عمل، بہترین دعا، عمدہ زندگی کا راز ہے، توحید نجات کا راستہ ہے، توحید کی بنا پر آسمان بھر گناہ اور زمین بھر خطائیں معاف ہوتی ہیں، توحید

جنت میں داخلہ اور جہنم سے بچاؤ کا واحد ذریعہ ہے، توحید کامیابی کی کنجی ہے۔

تو ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ توحید پرست بنے توحید سب سے بڑی دولت ہے اس کی حفاظت گویا کی دنیا وآخرت کی کامیابی کی سعادت ہے۔ایک مسلمان، موحد کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت، ربوبیت اور اسماء وصفات میں ذرہ برابر بھی شرک کی مداخلت کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو توحید پرست بنائے، اللہ تعالیٰ کی توحید کو شرک کی آمیزش سے پاک رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خودآزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. توحید کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟ وضاحت کریں۔
2. توحید کی تین اقسام کون سی ہیں، اور ہر ایک کی مختصر وضاحت کریں؟
3. شرک کی کون کون سی صورتیں ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کی مثال دیں؟
4. قرآن مجید میں توحید کی کیا اہمیت بیان کی گئی ہے؟ کم از کم دو آیات کے حوالے سے وضاحت کریں۔
5. عقیدہ توحید انسان کی زندگی پر کون سے مثبت اثرات مرتب کرتا ہے؟ تفصیلی جواب دیں۔

یونٹ نمبر: 02

قرآن مجید اور عقیدہ رسالت

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 25
یونٹ کے مقاصد 25
قرآن مجید اور عقیدہ رسالت 26
خود آزمائی 34

یونٹ کا تعارف

عقیدہ رسالت، توحید کے بعد اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ عقیدہ رسالت پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے۔ خاص طور پر جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت جو سلسلہ رسالت کی آخری کڑی ہے اس کو قرآن مجید نے نہ صرف بیان فرمایا بلکہ اللہ نے اپنی اطاعت کو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ جوڑ کر یہ پیغام دیا کہ کامیابی و فلاح صرف اور صرف اتباع رسول میں ہی ہے۔ قرآن مجید میں کثرت سے ایسی آیات ملتی ہیں جن میں عقیدہ رسالت کو واضح الفاظ میں جزئیات وامثال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے. اس یونٹ میں رسالت کا مفہوم، مقام و مرتبہ، حیثیت، اور انسان کے لیے نجات میں عقیدہ رسالت کا کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ رسالت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم جان سکیں۔

2۔ رسالت کے مقام و مرتبہ اور حیثیت کو جان سکیں۔

3۔ رسالت سے انکار کی صورت میں انجام جان سکیں۔

4۔ انسان پر عقیدہ رسالت کیا اثرات مرتب کرتا ہے اس کو جان سکیں۔

قرآن مجید اور عقیدہ رسالت

ربِ ذوالجلال والاکرام کے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ چھٹی صدی عیسوی کے وہ لوگ جو دینِ حنیف کو چھوڑ کر شرک کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکے اور معبودِ حقیقی سے منہ موڑ کر سینکڑوں خود ساختہ خداؤں کے سامنے اپنی پیشانیاں رگڑ رہے تھے، اچانک ایک ایسی زور دار آواز سے ۔۔۔ کہ جس کو وقت کا ہر ذی شعور سن اور سمجھ سکتا ۔۔۔ چونک اٹھتے کہ : "لوگو، فلاں مقام پر ایک کتاب موجود ہے، جاؤ اسے تلاش کر کے اس پر عمل کرو اور اس میں اپنی دنیاوی اور اخروی فلاح کے سامان تلاش کرو کہ یہ کتاب کتابِ ہدایت ہے ۔۔۔ اور اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کچھ بھی شک نہیں" ۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

پھر یہ بھی نہیں ہوا کہ ایک خاص وقت میں ایک کتاب آسمانوں سے اس طرح اترتی کہ اس کے نزول کی کیفیت کو وقت کا ہر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ۔۔۔ اور اس بناء پر لوگوں کو اس کے "منزل من اللہ" ہونے کا یقین ہو جاتا تاکہ وہ اپنی زندگیاں اس کی ہدایات کے تحت بسر کر سکیں ۔۔۔ یہ، اور ایسی کسی بھی صورت کو واقعات اور عقل تسلیم کے لیے تیار نہیں ہیں!

بلکہ ہوا تو یہ ہوا کہ انہی لوگوں میں رہنے اور بسنے والے ایک ممتاز خاندان، خاندانِ قریش کے ایک معزز گھرانے میں ایک بچے کی ولادت با سعادت ہوئی جس کا نام "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" اور "احمد صلی اللہ علیہ وسلم" رکھا گیا ۔۔۔ جس نے انہی لوگوں کے درمیان اپنے ایامِ شیر خوارگی گزارے، بچپن کی منازل طے کیں، جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا، کاروبار کیا، گھر آباد کیا ۔۔۔ اور پھر جب عمرِ عزیز کی چالیس بہاریں دیکھ چکا تو اچانک، جبکہ وہ ایک پہاڑی غار میں یادِ خدا میں مصروف تھا، اس پیغامِ خداوندی سے مشرف ہوا:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴿﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿﴾ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿﴾ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿﴾ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿﴾ ... العلق

"پڑھ اپنے رب کے نام سے کہ جس نے پیدا کیا، انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ کہ تیرا رب بہت ہی عزت والا ہے، جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو وہ سب کچھ سکھلایا جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔"

یہ نزول قرآن کی ابتداء تھی ۔۔۔ اب "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" صرف "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" نہیں، "محمد رسول اللہ" تھے۔ اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیگر ابنائے آدم سے ممتاز کرتا ہے:

(قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ..)...الکہف:110۔

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں (لیکن تم میں اور مجھ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے (جبکہ تمہیں یہ سعادت حاصل نہیں)"

۔۔۔اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں، کہاں ایک عام انسان اور کہاں سیدِ وُلدِ آدم، سید الانبیاء، سید الاولین والآخرین، خاتم النبیین، رحمت للعالمین، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کہ جنہیں إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ...الأعراف ۱۵۸) ...کا وہ فخرِ اعزاز حاصل ہوا کہ اس سے پیشتر کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔۔۔جس کا کلمہ پڑھنے کی صرف اس کی اپنی امت ہی مکلّف نہیں، انبیاء علیہم السلام تک سے اس پر ایمان اور اس کی تصدیق کا وعدہ لیا گیا:

(وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ (آل عمران ۸۱)

کہ "جب اللہ تعالیٰ نے (روزِ اول) تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دے کر (دنیا میں بھیجوں) پھر تمہارے پاس ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آ جائے، جو تمہاری کتابوں کو سچا بتلائے، تو تمہیں ضرور ضرور اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد (تائید) کرنی ہو گی۔۔۔اللہ تعالیٰ نے پوچھا، "کیا تم اقرار کرتے ہو اور میرے ساتھ اس پختہ عہد کے لیے تیار ہو؟"۔۔۔تو تمام انبیاء علیہم السلام نے جواب دیا، "(جی ہاں) ہم نے اقرار کیا"۔۔۔رب العزت نے فرمایا، "تو پھر اس بات پر گواہ رہو اور میں خود بھی اس پر گواہ ہوں"۔۔۔

اور اسی بناء پر شبِ اسری کو تمام انبیاء علیہم السلام کی امامت کا فخر صرف محمد رسول اللہ کو حاصل ہوا۔ لیکن یاد رہے کہ یہی محمد رسول اللہ، محمد بن عبداللہ بھی ہیں، ابوالقاسم بھی ہیں، عبداللہ اور طیب، طاہر کے ابا بھی ہیں، حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے نانا بھی ہیں۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا، سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے والدِ ماجد بھی ہیں۔۔۔امہات المومنین (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت سودہ رضی اللہ عنہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا) کے قابلِ فخر شوہر بھی ہیں۔۔۔گیارہ چچاؤں اور چھ پھوپھیوں کے بھتیجے بھی ہیں اور اسی لیے تو مخالفین نے یہ اعتراض کیا تھا:

(مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ... (الفرقان ۷)..

کہ "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے"

جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ... الفرقان ۲۰)...

کہ "(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ سے قبل جتنے بھی رسول بھیجے، وہ سبھی کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے"

ایک طرف یہ تمام انسانی علائق ہیں اور دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ ہیں۔۔۔ تقوی و طہارت، زہد و ورع، اخلاق و حیا اور شرافت و تقدس کا ایک ایسا کامل ترین نمونہ کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ بڑے بڑے سیرت نگار، سوانح نگار، فصح اللسان، لفاظ، اہلِ قلم بھی اس اعتراف پر مجبور کہ (لایمکن الثناء کما کان حقہ)

کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء کماکان حقہ ممکن ہی نہیں حتی کہ شاعرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی صرف یہی کہہ سکے

وأحسن منك لم تر قط عين و أجمل منك لم تلد النساء خلقت مبرأ من كل عيب كأنك قد خلقت كما تشاء(1)

جی ہاں، یہی وہ کامل و اکمل انسان ہے کہ تمام بنی نوع آدم میں سے جس کا ہم رتبہ وہم پلہ نہ کوئی ہوا، نہ ہو سکے گا۔۔۔ انہی کی طرف قرآن مجید کا بتدریج نزول شروع ہوا۔ ابتدائے وحی سے لے کر انتہائے وحی تک سیکنڑوں واقعات پیش آئے، حوادث رونما ہوئے، زمانے نے ہزاروں رنگ بدلے۔ ہر نئے موڑ پر، ہر رنگ میں، ہر پیش آنے والے اہم واقعہ پر وحی الہی سے رہنمائی کا سلسلہ جاری رہا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف کلامِ الہی کی تبلیغ و تعلیم اور تفہیم کے لیے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ بنے بلکہ امتِ مسلمہ کی عملی قیادت و راہنمائی کا فریضہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن مجید کی عملی تفسیر نظر آنے لگی۔ اسی بناء پر حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

خلقه القرآن "کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآنِ مجید (کی عملی تفسیر) ہے"

اور یہی سنتِ الہی بھی ہے۔ کسی بھی قوم کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی اور کتاب دونوں کو ذریعہ بنایا ہے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ نبی اور کتاب لازم و ملزوم ہیں، نبی کو کتاب سے الگ کر دیجئے تو محض کتاب ایک ایسی کشتی ہے کہ جس کا ناخدا کوئی نہ ہو اور جس کے انجان اور اناڑی مسافر تمام عمر زندگی کے سمندر میں بھٹکتے پھریں مگر ساحل

ناآشنا ہیں۔ اور اگر کتاب کو نبی سے الگ کر دیجئے تو خدشہ ہے کہ لوگ ناخدا کو ہی خدا سمجھ بیٹھیں۔ اور وہ مقصد کہ جس کی خاطر نبی کو مبعوث کیا گیا ہے، پہلی صربِ کاری خود اسی مقصد پر لگے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خیر الامم کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا، وہاں اسے ایک لائحہ عمل (قرآن مجید) بھی دیا گیا ۔اور جہاں اسے کتابِ ہدایت سے نوازا گیا وہاں اسے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسا ہادی و راہنما بھی ملا۔ اور یوں اس ارشادِ الٰہی کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (آل عمران ۱۶۴)...

"اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسانِ عظیم فرمایا کہ انہی کی جانوں میں سے، ان میں ایک ایسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتا ہے، ان کا تزکیہ نفس کرتا اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے، جبکہ اس سے قبل یہ لوگ صریحا گمراہی میں مبتلا تھے۔"

قرآنِ مجید اور متفقہ آثار و شواہد کی روشنی میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اس سے ہمارے لیے شانِ رسالت، مقامِ رسالت اور منصبِ رسالت کو سمجھ لینا نہ صرف انتہائی آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس بناء پر ہمیں ایک واضح لائحہ عمل بھی ملتا ہے:

رسول کوئی مافوق البشر ہستی نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں جتنے بھی انبیاء علیہم السلام لوگوں کی راہنمائی کے لئے آئے، سبھی ابن آدم تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کر اللہ رب العزت کا یہ ارشاد کہ : ﴿قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ... الأحقاف ۹) ۔ ان تمام عقائدِ باطلہ کی نفی کر دیتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے متعلق ہمارے ہاں آج کل پائے جاتے ہیں۔۔۔ مشرکین مکہ بھی کسی بشر کے رسول ہونے کو اچھنبا خیال کرتے تھے اور (هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ (الأنبیاء ۳)... کہہ کر لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رکھنے کا حربہ ان کے اسی عقیدہ کا غماز تھا.

دراصل یہ سوچ ان لوگوں کی ہے جو شرف انسانیت کے متعلق کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں، سورہ "والتین" میں اللہ تعالیٰ نے چار قسمیں کھا کر فرمایا:

(لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین ۴)۔

"ہم نے انسان کو سب سے اچھی صورت میں پیدا کیا ہے؟"

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (الاسراء ۷۰)۔" ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، انہیں بر و بحر میں سواری مہیا کی، پاکیزہ رزق عطا کیا اور انہیں اپنی کثیر مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی"

جبکہ سورۃ البینہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے متعلق فرمایا:

(أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (البینۃ ۷) ... کہ "یہ لوگ ساری مخلوق میں بہترین ہیں"

اور اس وقت تو یہ شرف اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے جب ایک انسان اپنے بشری مقتضیات کو افراط و تفریط سے بچا کر راہ اعتدال پر لے آتا ہے اور انہیں ایک خاص مرکز و محور عطا کر دیتا ہے۔ کیا ایک ایسے انسان کی فضیلت میں کچھ کلام ہو سکتا ہے کہ جس کے ہاتھ سلامت ہیں، لیکن یہ ہاتھ کسی پر ظلم و تعدی اور دست درازی کے لیے نہیں بڑھتے؟۔ جس کی آنکھیں بینائی سے معمور ہیں، لیکن ان نگاہوں کا زاویہ وہی رہتا ہے جو اللہ رب العزت نے اس کے لیے متعین کر دیا ہے۔ جو چل سکتا ہے لیکن اس کی چال غلط رخ اختیار نہیں کرتی؟ جو قوت گویائی تو رکھتا ہے، لیکن جھوٹ اور فواحش و لغویات اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتے؟ جو سوچ تو سکتا ہے لیکن اس کی سوچ شریعت کی متعینہ حدود سے تجاوز نہیں کر پاتی۔ جو کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی، لیکن وہی جو قدرت نے اس کے لیے حلال ٹھہرایا ہے۔ جو اہل و عیال تو رکھتا ہے، لیکن ان کی محبت اس کے دین کے لیے کبھی بھی خطرہ نہیں بنی۔ جو آرام کا متمنی ہے، لیکن میٹھی نیند کو تج کر، نرم و گرم بستر چھوڑ کر کڑکتے جاڑوں میں ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے مسجد کا رخ کرتا اور اپنے خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ (تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (السجدۃ ۱۶). کی یہ کتنی سچی تصویر ہے؟۔ تو پھر وہ کہ:

راتوں کے قیام سے جس کے پاؤں متورم ہوئے۔ جس کے لبوں سے ہمیشہ رشد و ہدایت کے پھول ہی برسے۔ جس کو "صادق و امین" کے لقب سے ان لوگوں نے یاد کیا جو اس کی جان کے درپے تھے۔ جس نے ان کے بوجھ بھی اپنے سر پر لادے اور انہیں منزلِ مقصود تک پہنچایا جو مخالفین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اسی سے دور بھاگ جانا چاہتے تھے۔۔۔ جس نے اس کی عیادت میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو روزانہ اس کے سر پر گھر کا کوڑا پھینکتی تھی۔۔۔ جس نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی (قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ... ۹۲) ... یوسف کا مژدہ سنایا۔ جو پسند کرتا تو پہاڑ سونے کے بن کر اس کے پابہ رکاب ہو جاتے، لیکن اس کے گھر میں مہینوں چولہا سرد رہتا ہے۔ جس کے ہزاروں جانثار ساتھی اس کے گھر کا کام کاج کرنے کو باعث سعادت خیال کرتے، لیکن اس کی بیٹی چکی

خود پیستی اور پانی کا مشکیزہ خود اپنے کندھوں پر اٹھاتی تھی۔ جوانِ رعنا مگر مجسم شرافت و حیا، جس کی آنکھوں نے کبھی غلط دیکھا نہ کانوں نے کبھی غلط سنا اور نہ دل و دماغ ہی نے کبھی غلط سوچا۔ اگر یہ ایک بشر ہونے کے باوجود ان عظمتوں کا حامل ہے تو بتایئے کہ اس کا بشر ہونا باعثِ فخر و فضیلت ہے یا باعثِ عار؟ افسوس، ہم شانِ رسالت کو سمجھ سکے نہ مقامِ رسالت کو۔ اگر کسی مافوق البشر ہستی کو رسول بنا کر انسانوں میں مبعوث کیا جاتا اور پھر اس کی اتباع بھی لازم قرار دی جاتی۔ (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ . . . .الاحزاب ۲۱) کا فرمان بھی ہمیں سنایا جاتا تو اس عادل و مصنف احکم الحاکمین کہ جس سے بڑھ کر کوئی بھی عادل و مصنف نہیں، کے عدل و انصاف پر حرف نہ آتا کہ ہمارے لیے بطورِ نمونہ ایک ایسی ہستی کو پیش کیا جا رہا ہے جس کے فطری تقاضے اور داعیے ہمارے فطری تقاضوں ہی سے الگ ہیں؟۔۔۔ اسی حقیقت کی نقاب کشائی قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: (لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا (الاسراء ۹۵) . . . کہ "اگر زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے بود و باش رکھتے تو ہم (ان کی رہنمائی کے لیے) ان پر آسمانوں سے کسی فرشتے ہی کو نازل فرماتے (مگر چونکہ یہاں انسان بستے ہیں، لہٰذا ایک افضل ترین انسان ہی کو ان کی ہدایت پر مامور فرمایا گیا ("ذرا ان الفاظ پر دوبارہ غور فرمایئے:

(لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ . . . آل عمران ۱۶۴) کہ "اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسانِ عظیم فرمایا کہ ان میں ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم، انہی کی جانوں میں سے مبعوث فرمایا"

حقیقت کس قدر آشکارا ہے؟ ایک طرف شانِ رسالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو مومنوں پر احسانِ عظیم جتلا رہے ہیں اور دوسری طرف یہ حقیقت اظہر من الشمس کہ جس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ان پر احسان عظیم ہے وہ ان میں، انہی کی جانوں میں سے مبعوث کیا گیا ہے۔ کیوں نہ ہو، مانگنے والے نے مانگا بھی تو یہی تھا:

(رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرۃ ۱۲۹) . . . کہ "اے ہمارے رب! ان میں ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سے مبعوث فرما، جو ان پر تیری آیات پڑھے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ نفس کرے، بے شک تو ہی تو غالب، حکمت والا ہے۔"

اور کون نہیں جانتا کہ "دعائے خلیل علیہ السلام" اور "نوید مسیحا" یہی آمنہ کے لال صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور کسے انکار ہے کہ خلیل اللہ کی یہ دعا لفظ بہ لفظ اور حرف بحرف پوری نہیں ہوئی، مگر "منھم" کی بجائے

"من انفسھم" کی مزید وضاحت کے ساتھ کہ کہیں مشرکین مکہ کی طرح ہم بھی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا۔ اور رسول بشر نہیں ہوتا:

تاہم "إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" کی حقیقت کے ساتھ ساتھ "يُوحَىٰ إِلَيَّ" کے قابلِ فخر اعزاز و امتیاز کو بھی ہر گز ہر گز نظر انداز نہ ہونا چاہئے، جو یقینا ایک بہت ہی بڑا اعزاز اور ایک بہت ہی بڑا امتیاز ہے۔

افسوس کہ ہم نے منصبِ رسالت کو بھی نہ سمجھا۔۔۔ جس کا فرض منصبی ہی "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" ہو۔۔۔ جس کو معلمِ کتاب و حکمت خود خدا بتلائے، اس سے بڑھ کر اور اس سے بہتر اور معلم کون ہو گا؟۔ لیکن ہم ہیں کہ کتاب کو رسول سے الگ کر کے، فرامینِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے اسے آئمہ کی زبان سے سمجھنا چاہتے ہیں؟ کیا رسول اللہ کی تعلیم میں ہمیں کوئی نقص نظر آتا ہے؟۔ مندرجہ بالا ارشاد الٰہی سے ہمیں کیوں اطمینان حاصل نہیں؟۔ کیا معاذ اللہ ہمارا یہ خیال ہے کہ ائمہ کا طریقِ تعلیم رسول اللہ کی نسبت زیادہ عام فہم، زیادہ پر اثر، زیادہ کامیاب اور زیادہ ذو معنی ہے؟۔ یا کیا ارشادِ ربانی "الدین یسر" سے ہمیں اتفاق نہیں؟ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر تقلید پر فخر کرنا اور اسے ضروری قرار دینا کیا خدا تعالیٰ کو تدبیریں سمجھانے والی بات نہیں کہ رسول اللہ کی بجائے ائمہ کو مبعوث کیا جانا چاہئے تھا؟۔ اپنی کتاب کی ترجمانی کا فریضہ انہیں سونپنا چاہئے تھا؟ یا، رسول اللہ کی رسالت کے ساتھ ساتھ ائمہ کی رسالت کا بھی قائل ہونا ضروری ہے؟ لیکن رسول اللہ تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی نہیں، عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی نہیں۔ اور ان کو بھی چھوڑیئے:

رسول اللہ تو وہ ہیں، جنہوں نے فرمایا، "اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوتا"

دیکھیے قرآن کیا فرماتا ہے:

(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (محمد ۳)...

کہ "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ اور (اس سے منحرف ہو کر) اپنے اعمال باطل نہ کرو"

پس ماہ ربیع الاول اگر تمہارے نزدیک عظمتوں کا حامل ہے، اگر رسول اللہ کی بعثت تمہارے لیے باعثِ خیر و برکت ہے، اور اگر تمہارے نزدیک آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونا باعثِ فخر ہے۔۔۔ تو اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری پیغام بھی سن لو:

"ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ و سنتی" کہ "میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر تم نے انہیں مضبوطی سے پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، یہ دو چیزیں کیا ہیں؟ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم"

(وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۱۳) وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ (النساء ۱۴)...

کہ "جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا تو اس کے لیے جہنم کا ابدی رسوا کن عذاب ہے۔

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. رسالت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟ وضاحت کریں۔
2. قرآن مجید کی روشنی میں انبیاء کا مقام و مرتبہ اور حیثیت کیا ہے؟ کم از کم دو آیات کے حوالے سے وضاحت کریں۔
3. رسالت سے انکار کرنے والوں کا قرآن میں کیا انجام بیان کیا گیا ہے؟ کسی ایک تاریخی مثال کے ساتھ وضاحت کریں۔
4. ایمان بالرسالت انسان کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟ تفصیلی جواب دیں۔
5. نبی کریم ﷺ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے کیوں ضروری ہے، اور اس کا پیغام کس طرح آفاقی حیثیت رکھتا ہے؟

یونٹ نمبر: 03

قرآن مجید اور عقیدہ آخرت

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 37
یونٹ کے مقاصد 37
قرآن مجید اور عقیدۂ آخرت 38
عقیدۂ آخرت کے انسانی اثرات 40
خود آزمائی 48

یونٹ کا تعارف

عقیدہ آخرت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔آخرت کی بنیاد پر ہی عمل کی اہمیت ہے۔ قرآن مجید میں کثرت سے ایسی آیات ملتی ہیں. جن میں عقیدہ آخرت کو واضح الفاظ میں جزئیات وامثال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے. اس یونٹ میں آخرت کے مناظر اور آخرت میں جنت و دوزخ کے فیصلہ کی بنیاد کو واضح کیا گیا ہے۔انسان کی ذات پر عقیدہ آخرت کس طرح اثرانداز ہوتا ہے اور عمل کے لیے ابھارتا ہے،اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ آخرت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم جان سکیں۔

2۔ آخرت کو قرآن کی روشنی میں بیان کر سکیں۔

3۔ آخرت میں جزاو سزا کی صورتیں جان سکیں۔

4۔ انسان کی زندگی پر عقیدہ آخرت کے اثرات کو جان سکیں۔

قرآن مجید اور عقیدہ آخرت

"آخرت" کے لفظی معنی ہیں" بعد میں آنے والی"۔ جیسے "دنیا" کے معنی ہیں" قریب ترین"۔ گویا آخرت کا مطلب ہے موجودہ زندگی کے بعد آنے والے دوسری دنیا کی زندگی۔

قرآنِ مجید میں اللہ پر ایمان لانے کے بعد سب سے زیادہ زور آخرت پر ایمان لانے پر دیا گیا ہے۔ دنیا میں کیے جانے والے اعمال اور اُن کے نتائج کی بنیاد عقیدہ آخرت پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد نہ ہو تو انسان کے دنیاوی اعمال کا محاسبہ ممکن نہ ہو سکے۔ عقیدہ آخرت کو اسلام میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر باقی عقائد بے معنی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان جزاوسزا کے نظریے کا قائل نہ ہو تو پھر وہ کسی قسم کی نیکی و ہدایت کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت کا قائل نہیں ہوگا۔

عقیدہ آخرت کی اہمیت اس امر سے بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید میں اللہ اور آخرت پر ایمان اکثر مقامات پر ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آخرت کی حقیقت قرآنِ مجید کی آیات کی روشنی میں

بَلْ تُؤْثِرُونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا ۔ وَٱلْـَٔاخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰٓ ۔ **الاعلیٰ: ۱۶،۱۷**

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ ٱلشَّهَوَٰتِ مِنَ ٱلنِّسَآءِ وَٱلْبَنِينَ وَٱلْقَنَـٰطِيرِ ٱلْمُقَنطَرَةِ مِنَ ٱلذَّهَبِ وَٱلْفِضَّةِ وَٱلْخَيْلِ ٱلْمُسَوَّمَةِ وَٱلْأَنْعَـٰمِ وَٱلْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَـٰعُ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ وَٱللَّهُ عِندَهُۥ حُسْنُ ٱلْمَـَٔابِ ۔ **آلِ عمران: ۱۴**

لوگوں کے لیے مرغوبات نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے، وہ تو اللہ کے پاس ہے۔

وَمَا هَـٰذِهِ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَآ إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ ٱلدَّارَ ٱلْـَٔاخِرَةَ لَهِىَ ٱلْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ ۔ **العنکبوت: ۶۴**

یہ دنیا کی زندگی تو کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں۔ اور آخرت کا گھر ہی یقیناً اصل زندگی ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا۔

إِلَى ٱللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۔ **ہود: ۱۱**

اللہ ہی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آخرت، زندگی کی آزمائش کے لیے ہے۔

ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلْمَوْتَ وَٱلْحَيَوٰةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْغَفُورُ۔ **الملک: ۲**

اُسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔ اور وہ بہت زبردست بھی ہے اور بہت بخشنے والا بھی۔

دنیا کی زندگی مختصر ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِٱلْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ ٱللَّهُ وَعْدَهُۥ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ۔ **الحج: ۴۷**

اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ عذاب کے بارے میں آپ سے جلدی مچا رہے ہیں۔ اور اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اور یقیناً آپ ﷺ کے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔

تَعْرُجُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَٱلرُّوحُ إِلَيْهِ فِى يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُۥ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ۔ **المعارج: ۴**

ملائکہ اور رُوح اُس کی جانب چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

قَٰلَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ لَّوْ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ۔ **المومنون: ۱۱۵، ۱۱۴**

اللہ فرمائے گا کہ (واقعتاً) تم لوگ بہت تھوڑا ہی عرصہ ٹھہرے ہو۔ کاش تم نے یہ اُس وقت جانا ہوتا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضُول ہی پیدا کیا ہے۔ اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوٓا۟ إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَىٰهَا۔ **النّازعات: ۴۶**

جس دن یہ لوگ اُسے دیکھ لیں گے تو انہیں یوں محسوس ہو گا کہ (یہ دنیا میں یا حالتِ موت میں) بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں۔

اعمالنامے تحریر کیے جا رہے ہیں

وَلَقَدْ خَلَقْنَا ٱلْإِنسَٰنَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِۦ نَفْسُهُۥ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ ٱلْوَرِيدِ۔ إِذْ يَتَلَقَّى ٱلْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ ٱلْيَمِينِ وَعَنِ ٱلشِّمَالِ قَعِيدٌ۔ مَّا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔ **ق: ۱۸، ۱۷، ۱۶**

اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں جو اس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے۔ اور ہم تو اس

سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (اور ہمارے اس براہ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو۔

وَهُوَ ٱلَّذِى يَتَوَفَّىٰكُم بِٱلَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِٱلنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰٓ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ وَهُوَ ٱلْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِۦ ۖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ۔ **الانعام: ۶۱،۶۰**

وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے۔ اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔ پھر دوسرے روز وہ تمہیں اِسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے۔ تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو۔ آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے۔ پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو اپنے بندوں پر وہ پُوری قدرت رکھتا ہے۔ اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی مَوت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں۔ اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا۟ وَءَاثَٰرَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَىْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِىٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ۔ **یٰس: ۱۲**

یقیناً ہم ہی زندہ کریں گے مُردوں کو جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں۔ اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھُلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔

وَكُلُّ شَىْءٍ فَعَلُوهُ فِى ٱلزُّبُرِ۔ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ۔ **القمر: ۵۳،۵۲** اور وہ تمام اعمال جو ان لوگوں نے کیے ہیں وہ صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے۔

عقیدہ آخرت کے انسانی اثرات

مذہب نے جن باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے وہ سب باتیں ایسی ہیں جن کا ہماری زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے اور ان کے ماننے یا نہ ماننے سے ہماری اس دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر پورا اثر پڑتا ہے اور یہی حال اس عقیدۂ قیامت کا بھی ہے کہ اگر اس کو مان کر زندگی بسر کی جائے تو ہمارے اخلاق و معاملات، اور ہماری زندگی کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہوگا۔ اور اگر اس کو کوئی تسلیم نہ کر کے زندگی گزرے تو اس کے معاملات و اخلاق کا طرز کچھ اور ہوگا۔ قرآن مجید نے صرف یہی نہیں بتایا ہے کہ قیامت کو ماننا ضروری ہے اور کیوں ضروری ہے بلکہ یہ بھی واضح کیا

ہے کہ اس کے ماننے یا نہ ماننے سے زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، لیکن قرآن مجید نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ ایک صحبت میں کسی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا، اس لیے قرآن مجید کی رو سے عقیدہ قیامت کے جو اثرات انسان کی زندگی پر پڑتے ہیں، ان کا صرف ایک پہلو آج تمھارے سامنے رکھنا ہے، وہ یہ کہ انسان کے نیک و بد ہونے میں اس عقیدے کو کیا دخل ہے۔

اس بارے میں قرآن مجید نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کا دار و مدار صرف دو باتوں پر ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ اس دنیا میں اس کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ وہ خود بخود پیدا ہوا ہے، اور وہ اس کے لیے آزاد ہے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے، جس کو جی چاہے مارے، جس کا مال چاہے ہڑپ کرے اور جس پر جی چاہے ظلم کر بیٹھے۔ بلکہ اس کی حیثیت یہ ہے کہ اس کا ایک پیدا کرنے والا ہے، اور اس کے پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت ہے اور اس کے پیدا کرنے والے نے اسے آزادی تو یقینا دے دی ہے کہ ایک خاص دائرے سے جو کچھ چاہے کر سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اسے وہ پسند بھی کرتا ہے بلکہ انسان کو بری یا بھلی باتیں بتادی ہیں اور وہ اچھی باتوں کو پسند اور بری باتوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور ہر انسان سے اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی ٹھہرائی ہوئی پسندیدہ باتوں کو اختیار کرے اور ناپسندیدہ باتوں سے بچے۔ قرآن کہتا ہے جو لوگ یہ سمجھ کر زندگی گزارتے ہیں اور ہر کام میں اللہ کی خوشی یا ناخوشی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں ان کا حال دنیا میں ان لوگوں سے مختلف ہوتا ہے جو اپنے کو کسی کا پیدا کردہ نہیں سمجھتے یا خود اپنے نفس کو اپنا بادشاہ سمجھتے ہیں، اور جو جی میں آتا ہے، کرتے رہتے ہیں۔ پہلی طرح کے لوگ یہ سمجھ کر زندگی گزارتے ہیں کہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اس کے ان پر حقوق ہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لوگ اس کے فرماں بردار بن کر زندگی گزاریں اور جن باتوں کا اس نے حکم دیا ہے اس کے خلاف نہ چلیں۔ یہاں تک کہ بہت سے ایسے کام بھی جن کو یہ لوگ آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں محض اس لیے نہیں کرتے کہ ان کا کرنا پیدا کرنے والے کی خوشی کے خلاف ہوتا ہے۔ گویا ان کے پیدا کرنے والے نے ہر طرح کے کام کرنے کی جو قوت اور آزادی ان کو دی ہے، اس سے وہ از خود یہ سمجھ کر دست بردار

ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علاوہ اور احسانوں کے ان کو جو یہ بلند مقام عطا فرمایا ہے کہ وہ دنیا کی اور مخلوقات کی طرح مجبور نہیں ہیں بلکہ ان کو ان سے ممتاز کرنے کے لیے ایک طرح کی آزادی بھی دے دی ہے، تو خود اس نعمت کی شکر گزاری کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے اس حق کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کریں، اور در حقیقت ان کا یہ سمجھنا صحیح بھی ہے، عقل بھی یہی چاہتی ہے اور انسان کی فطرت بھی اسی کا مطالبہ کرتی ہے کہ انسان اپنے منعم و محسن کی شکر گزاری کرے، چناں چہ اسی بنا پر جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کو عام طور سے برا کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ہمارا سب سے بڑا منعم و محسن ہے، اسی نے ہم کو پیدا کیا، ہمارے زندہ رہنے کے لیے ہر طرح کے سامان فراہم کیے، ہمیں عقل دی، فہم عطا فرمائی، اور ان سب سے بڑھ کر ہمارا درجہ اپنی بے شمار مخلوقات سے بہت اونچا اور بلند بنایا، تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اس کی اطاعت و فرماں برداری کریں اور اس کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزاریں؟ اس کا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ یہی ہمارا فرض ہونا چاہیے چناں چہ خود قرآن مجید بھی اسی بنیاد پر انسان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسے خدا کا مطیع و فرماں بردار بن کر دنیا میں رہنا چاہیے کیوں کہ وہ ان کا خالق اور حاکم ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ. إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ. (میں نے جن و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں، میں ان سے ذرا بھی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں پلائیں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کو رزق دینے والا ہے، قوت والا ہے، زبردست ہے۔ سورۃ الذاریات ۵۶ تا ۵۸)

اور اسی بنا پر جو لوگ نیک اور سمجھ دار ہوتے ہیں، وہ دنیا میں اپنا فرض یہی سمجھتے ہیں۔ حضرت لقمانؑ خدا کے ایک نہایت ہی نیک بندے گزرے ہیں، ان کا دل بھی خدا کے انعامات کے تصور سے اس کے آگے جھکا ہوا تھا، چناں چہ وہ خود بھی خدا کی اطاعت کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور اپنی اولاد سے بھی وہ یہی چاہتے تھے، چناں چہ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (اے پیارے بیٹے اللہ سے شرک نہ کر، بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ سورۃ لقمان، آیت: ۱۳)

ایسے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے چہیتے بندے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت اور شوکت و حشمت بہت کچھ دے رکھا تھا۔ چناں چہ وہ یہ نعمتیں پاکر اترائے نہیں تھے اور نہ ان کو پاکر وہ خدا سے غافل ہوگئے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ جتنا بھی اپنے فضل سے نوازا تھا اتنا ہی ان کا دل خدا کے حضور میں جھکا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ کہیں جارہے تھے۔ راستے میں ایک وادی میں ان کا گزر ہوا تو وہاں چیونٹیوں نے آپس میں گفتگو کی جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سن لیا۔ چوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص فضل ہوا تھا، اس لیے اس کا تصور کر کے وہ خدا کے حضور میں جھک گئے اور اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں دعا کی:

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ

(اے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو بخشیں اور مجھے ایسی توفیق دے کہ میں ایسے نیک کام کروں جنھیں تو پسند فرمائے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شامل فرما۔ سورۃ النمل، آیت: ۱۹)

اس آیت میں دیکھو کہ خدا کے فضل و انعام کا تصور آنے سے ان کے دل میں کس طرح شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہوا اور اس جذبے نے کس طرح ان کے دل میں نیک بننے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ایسے ہی قرآن شریف میں اور بہت سے بندوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا طریقہ یہی تھا کہ خدا کے انعامات و احسانات کے تصور سے ہمیشہ اس کے سامنے جھکے ہوئے رہتے تھے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کرنے کے لیے کسی حال میں آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اب اس کے برعکس جو لوگ نہ اپنے لیے کسی خالق کا تصور رکھتے ہیں اور نہ وہ اپنے اوپر اپنے نفس کے علاوہ کسی کا حق سمجھتے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہتے ہیں، بے جھجک ہو کر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ کسی ضابطہ اخلاق وغیرہ کی پابندی کسی حال میں نہیں کر سکتے، وہ کوئی نیک کام اگر کریں گے بھی تو اس میں ان کی اپنی غرض چھپی ہوگی۔ ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ اپنے خالق و مالک کی ناشکری کر کے اپنے کمینے پن اور حد درجہ بداخلاقی و عقلی پستی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ایسے لوگ دنیا میں فتنے و فساد کا بھی باعث بنتے ہیں کیوں کہ ایسے لوگوں کے لیے

برائی سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی جو اپنے سب سے بڑے منعم و محسن کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں سمجھتا، وہ بھلا اوروں کے حقوق کا کیا لحاظ کر سکتا ہے۔ وہ تو بس دنیا میں اپنا بھلا چاہے گا اور کسی کا بھی نہیں۔ اس کو اگر کوئی قانون وغیرہ سے بھی جکڑ کر ٹھیک بنانا چاہے گا تو وہ نہیں ہو سکے گا بلکہ وہ خود قانون توڑنے کے لیے مختلف طریقے اور بہانے بنالے گا اور اس کا کوئی کچھ نہیں کر سکے گا، جیسا کہ تم آج کل دیکھ رہے ہو کہ خدا کے باغی ہر طرح کے قانون کی موجودگی میں سب کچھ کر رہے ہیں اور روکنے والے ان کو روکنے سے عاجز ہیں۔ بہر حال، اس دنیا میں انسان کے نیک بننے اور نیک بنے رہنے کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک بات تو یہی ہے کہ اس کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ دنیا اور اس کے ساتھ وہ آپ سے آپ پیدا نہیں ہو گیا بلکہ اس پوری کائنات کا ایک خالق ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اور وہ اس کے ہر اچھے یا برے کام کا نگراں ہے۔ اور وہ اس کی اچھی باتوں کو پسند اور بری باتوں کو ناپسند کرتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ اسی کے ساتھ یہ عقیدہ رکھے کہ انسان کی زندگی بس اتنی ہی نہیں کہ وہ اس چند روزہ دنیا میں رہ کر ختم ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام کچھ جو اس نے اس دنیا میں کیا ہے ختم ہو جائے گا۔ اس پر اس کو کوئی جزا یا سزا نہیں ملے گی۔ بلکہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ہمارے ہر اچھے اور برے کاموں کا ہمیں بدلہ ملے گا کیوں کہ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو بالکل بے کار اور عبث پیدا کیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی مقصد اور حکمت پوشیدہ ہے اور اس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بڑا رحمٰن اور رحیم ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کا کام بس یہی ہو کہ وہ چند روزہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اور جو برے بھلے کام کر سکتا ہے کر کے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائے۔ اس طرح سوچنے کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو حکیم اور رحیم نہیں مان رہے ہیں چناں چہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے ہونے پر جو دلیلیں دی ہیں، ان میں ایک ایسی بھی ہے کہ وہ اس کو اپنی رحمت و حکمت کا صریح تقاضا قرار دیتا ہے۔

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (تمھارے آقا نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (لہٰذا) وہ تمھیں ضرور ضرور قیامت کے دن جمع کرے گا۔ سورۃ الانعام، آیت: ۱۲)

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت میں اللہ کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت اور رحمت بیان کرنے کے بعد اس کے مالک یوم الدین ہونے کا اظہار کیا گیا ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی صفتوں کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ مانے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا کہ ایک دن جزا و سزا ضرور ہونا چاہیے، چناں چہ اسی بنیاد پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات کی حقیقتوں پر غور کرتے ہیں وہ خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ دنیا بے غرض و بے مقصد نہیں پیدا کی گئی ہے اور پھر اس سے اس کا ذہن خود بخود اس طرف مڑ جاتا ہے، کہ پھر ہم جو کچھ یہاں کرتے ہیں اور جس کا بسا اوقات اس دنیا میں نتیجہ نہیں ملتا اس کا انجام ہمارے سامنے ضرور آئے گا:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ. الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

(زمین اور آسمان کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں بلاشبہ ان عقل مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو اللہ تعالیٰ کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں یاد کرتے ہیں، اور زمین و آسمان کی پیدائش کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے مالک یہ سب تو نے بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔ تیری ذات اس سے پاک ہے کہ تو کوئی بیکار کام کرے (اور جب ایسا ہے تو ایک نہ ایک دن تو اپنی مخلوقات کا حساب بھی لے گا۔) اس حساب کے دن تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچانا۔ سورۃ آل عمران، آیت ۱۹۰ اور ۱۹۱)

اس تفصیل سے یہ بات تمھاری سمجھ میں آگئی ہو گی کہ درحقیقت خدا کے تسلیم کر لینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم ایک یوم الدین بھی تسلیم کریں۔ بہر حال عقیدہ آخرت کو چاہے ایمان باللہ کا ایک جزو سمجھو یا اس کو الگ سے ایک عقیدہ مان لو۔ کہنا یہ ہے کہ جس طرح خدا کو تسلیم کر لینے اور اس کا اپنے اوپر حق مان لینے کے بعد انسان خود اپنی خوشی سے آزادی سے دست بردار ہو جاتا ہے اور اب وہ وہی کر سکتا ہے جس کو کرنے کی اس کے خالق نے اجازت دے دی ہو اور اسی طرح وہ ان اصولوں کا پابند بن جاتا ہے جو سب کے فائدے کے لیے سب کے پیدا کرنے والے نے ٹھہرا دیے ہیں۔ بالکل اسی طرح یہ جزا و سزا کا عقیدہ بھی انسانوں کو ان خدائی احکام کا پابند بنا کر رکھتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو اگر یہ عقیدہ انسان کے دل میں پوری طرح بس جائے تو وہ محض خدا کو مان لینے سے بھی پوری طرح اس کے

احکام کا پابند نہیں بن سکتا کیوں کہ وہ اس صورت حال میں خیال کر سکتا ہے کہ زندگی جب یہی دنیاوی زندگی ہے تو چلو جی کھول کر عیش اڑالیں۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی فہرست میں ہمارا نام ناشکروں میں لکھ جائے گا۔ سو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اللہ نے تو خود ہی آزادی دے رکھی ہے لیکن اس کے برعکس اگر انسان یہ سمجھے کہ وہ جو کچھ کرے گا اس کا انجام سامنے آئے گا، اور اللہ نے جو آزادی ہمیں بخشی ہے، وہ اسی لیے ہے کہ ہم اپنے اختیار سے اس کی اطاعت و بندگی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیں تو وہ ہر حال میں برائیوں سے بچنے اور اچھائیوں کے اختیار کرنے کی فکر کرے گا۔ ایسے لوگ ہر طرح کی اچھائیوں کا کام کریں گے لیکن اس لیے نہیں کہ ان کو دنیا میں نام و نمود حاصل کرنے کا شوق ہے یا ان کے ذریعہ اپنا کوئی کام نکالنا چاہتے ہیں، بلکہ محض اس لیے کہ ان کے خالق نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کے حکم پر عمل کرنے میں ان کو آخرت کی بھلائیاں نصیب ہوں گی۔ ان ہی لوگوں کا حال قرآن مجید میں بتایا گیا ہے:

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا. وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا. إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا.

(اپنی منتوں کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں تکالیف ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں گی اور وہ اللہ کی محبت میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تمھیں صرف اللہ کی خوشی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ کسی شکر گزاری کے طلب گار ہیں۔ سورۃ الانسان، آیت: ۷ تا ۹)

اور یہ لوگ برائیوں سے بالکل دور دور رہیں گے۔ اس لیے نہیں کہ ان کو بدنامی کا یا پولیس کی دھر پکڑ کا اندیشہ ہوگا کیوں کہ اس اندیشے کے تو سو علاج ممکن ہیں، بلکہ محض اس لیے کہ اللہ کی نگاہیں ان کو دیکھ رہی ہیں اور جو کچھ کریں گے اس کا انجام ان کے سامنے آئے گا۔

قرآن مجید میں ایک موقع پر دو بھائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے ایک بھائی حسد میں مبتلا ہو کر اپنے دوسرے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے لیکن دوسرا بھائی محض اللہ اور آخرت کی بازپرس کے خوف سے اس پر کوئی دست درازی کرنے سے ڈرتا ہے:

لَئِن بَسَطتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ. إِنِّي أُرِيدُ أَن تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ

(اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور اس طرح دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔ سورۃ المائدۃ، آیت: ۲۸ اور ۲۹)

اور یہی نہیں کہ آخرت سے ڈرنے والے برائیوں میں عملاً حصہ نہیں لیں گے بلکہ اگر یہ خوف پوری قوت سے انسان کے دل میں جم جائے تو وہ برائی کا خیال بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ:

وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ (جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، چاہے تم اسے ظاہر کرو یا چھپالو اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۸۴)

اس اندیشہ سے وہ برے خیالات سے بھی گھبرائے گا اور اگر کبھی برے خیالات اس کے دل میں آئیں گے بھی تو وہ انجام کا تصور کر کے ان کو دور پھینک دے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ (اور وہ لوگ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں جب شیطان کا کوئی وسوسہ ان کے دل میں آتا ہے تو وہ چوکنّے ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کا راستہ ان پر روشن ہو جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف، آیت: ۲۰۱)

غرض اللہ پر ایمان اور قیامت کا یقین ہی نیکی کی بنیادیں ہیں۔ جب تک یہ دل میں پیدا نہیں ہوں گی، آدمی بے ایمانی، دغا بازی، رشوت، فریب اور جھوٹ وغیرہ سے بچ نہیں سکتا اور ان کے مقابل کی اچھی صفتوں کو اختیار کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصلاح کرنے آتے ہیں تو سب سے پہلے وہ انھیں بنیادی باتوں کو پیش کرتے ہیں اور ان کو ہر شخص کے دل میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، چناں چہ جب یہ باتیں دل میں بیٹھ جاتی ہیں تو ہر طرح کی برائیاں اس طرح مٹ جاتی ہیں گویا وہ تھیں ہی نہیں۔ ہماری تاریخ میں جو اچھا زمانہ گزرا ہے اور اس میں جو اچھے لوگ پیدا ہوئے تھے وہ انھیں باتوں پر ایمان لانے کی وجہ سے اچھے ہوئے تھے۔ آج بھی اگر ہم اچھے بننا چاہتے ہیں تو خدا کا

خوف اور آخرت کی جواب دہی کا اندیشہ ہر وقت ہمارے دل میں ہونا چاہیے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ حالت بھی بدلے اور اس میں نیکی اور بھلائی پھیلے تو ہمیں دوسروں کو بھی انھیں باتوں کی دعوت دینی چاہیے۔

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. آخرت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟ وضاحت کریں۔
2. قرآن مجید میں عقیدۂ آخرت کو کن دلائل کے ذریعے بیان کیا گیا ہے؟ کم از کم دو آیات کے حوالے سے وضاحت کریں۔
3. آخرت میں جزا و سزا کی کیا صورتیں ہوں گی، اور کن اعمال پر کون سا بدلہ دیا جائے گا؟
4. عقیدۂ آخرت انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔
5. قیامت کی نشانیاں اور اس دن کے حالات کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بیان کریں۔

یونٹ نمبر: 04

قرآن مجید اور عبادات

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف..... 52
یونٹ کے مقاصد 52
قرآن مجید اور عبادات 53
عبادت کا معنی و مفہوم..... 55
تعریف..... 55
عبادت کی اقسام 56
۱۔ قلبی..... 56
۲۔ قولی..... 58
۳۔مالی..... 58
۴۔بدنی 58
۵۔اطاعت 58
معبودانِ باطلہ کی بندگی کا کفر 59
طاغوت کی عبادت ترک کرنا..... 64
حق کا برملا اظہار کرنا 64
طاغوت سے علیحدگی اختیار کرنا 66
طاغوت سے قتال کرنا..... 67
طاغوت سے محبت اور دوستی نہ رکھنا..... 67
خود آزمائی 68

یونٹ کا تعارف

عقائد کی درستگی کے بعد اللہ تعالیٰ کا سب سے اہم حکم عبادات کی ادائیگی ہے۔ کیونکہ قرآن نے انسان اور جن کی تخلیق کا مقصد ہی عبادت بیان کیا ہے۔ قرآن مجید میں کثرت سے ایسی آیات ملتی ہیں. جن میں عبادات کو فرض کیا گیا ہے اور عبادات کی روح کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عبادات کی مختلف اقسام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس یونٹ میں عبادات کے اسلامی نظریے کو بیان کیا گیا ہے اور عبادات کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ عبادت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم جان سکیں۔

2۔ عبادت کی اقسام جان سکیں۔

3۔ عبادت کی صورتیں جان سکیں۔

4۔ انسان کے لیے عبادات کی اہمیت جان سکیں۔

5۔ قرآن مجید میں عبادات کی کتنی پر زور تاکید کی گئی ہے کو جان سکیں۔

قرآن مجید اور عبادات

یہ پوری کائنات اور کائنات کی ہر ہر چیز (نافرمان انس و جن کے ماسوا) اللہ رب العزت کی عبادت گزار ہے البتہ عبادت کا طریقہ ہر مخلوق کے لیے الگ الگ ہے: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ) (بنی اسرائیل: ۴۴)

"کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔"

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ (الحج: ۱۸)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اللہ کے آگے سر بسجود ہیں۔"

زمین و آسمان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ) (فصّلت: ۱۱)

"پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں (سا) تھا پس اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے دونوں نے عرض کیا ہم بخوشی حاضر ہیں۔"

فرشتے وہ مخلوق ہیں جن کی تخلیق ایک شفاف نور سے ہوئی ہے۔ فرشتوں کی عبادت یہ ہے کہ وہ دن رات، ہر لمحے اور ہر گھڑی اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں اور وہ کسی بھی معاملے میں اللہ کی کبھی بھی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ مسلسل اللہ کی تسبیح کرتے ہیں؛ ایک لمحہ رکنے کا نام نہیں لیتے:

(وَمَنْ عِندَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ﴿﴾ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ) (الانبیاء: ۱۹۔۲۰)

"اور جو (فرشتے) اُس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے نہ سرکشی کرتے ہیں اور نہ ہی تھکتے ہیں۔ رات دن (اُس کی) تسبیح کرتے رہتے ہیں اور ذرا سی بھی کاہلی نہیں کرتے۔"

(لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ) (التحریم: ۶)

"جو حکم اللہ ان کو دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اس کو بجالاتے ہیں۔"

انسانی تخلیق کا مقصد بھی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) (الذاریات: ۵۶)

"اور میں نے جن اور انسان اسی لیے ہی بنائے ہیں کہ وہ میری بندگی کریں۔"

اللہ تعالیٰ نے زمین کو زیب و آرائش سے بھر دیا، انسان کے دل میں مال، اولاد اور عزت کی محبت ڈال دی اور پھر انسان کو اس کی رنگینیوں کے بیچ چھوڑ دیا تاکہ آزمائے کہ یہ دنیا کی رنگینیوں میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرتے ہوئے اللہ کی خوشنودی کا طلبگار رہتا ہے یا اس کے احکامات سے اعراض کرتے ہوئے شیطان کی پوجا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا) (الدھر: ۲)

"بے شک پیدا کیا ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے تاکہ اُس کا امتحان لیں، ہم نے اُسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

(الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا) (الملک: ۲)

"اُس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ آزمائے کون تم میں سے نیک عمل کرنے والا ہے۔"

(إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا) (الکہف: ۷)

"جو کچھ سر و سامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمائیں ان میں کون نیک عمل کرنے والا ہے۔"

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ آزمانا چاہتا ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے مقصد "عبادت" کو پورا کرتا ہے یا نہیں، جب انسان کی تخلیق عبادت کے لئے ہوئی ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی عبادت کا انداز کیا ہو؟ اسے کس طرح اپنے رب کی بندگی کرنی ہے؟ اور عبادت کہتے کسے ہیں؟

عبادت کے مفہوم کے حوالہ سے محمد قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جس روز" وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ "ایک عبادت تھی... اُس روز کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی زمین پر پیر بھی رکھ کر دکھائے؛ اِن کو نسل در نسل غلام بنا کر رکھنا، اِن کے وسائل کو لوٹنا اور خود اِنہی کی بیوروکریسی سے اپنے لیے ٹیکس کلکٹری کروانا تو بہت دور کی بات ہے!

*جس روز "طلب العلم فریضۃ" ایک عبادت تھی... اُس روز یہاں کوئی علمی پسماندگی اور سائنسی بدحالی نہیں تھی، بلکہ اُس روز امتِ مسلمہ علم اور آگہی میں دنیا کی امام تھی۔ یہی یورپ ہے جو اُس روز ہمارے سکولوں اور ہماری جامعات میں داخلے لیتا پھرتا تھا!

*جس روز " فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ "ایک عبادت تھی... اُس روز مسلم معاشرے دنیا کے خوشحال ترین معاشرے تھے!

*جس روز "کلکم راعٍ وکلکم مسئولٌ عن رعیتہ" ایک عبادت تھی، اور "والی" یہ جانتا تھا کہ دراصل وہ ایک راعی (چرواہا) ہے جس کو اپنے گلے کی بابت پوچھ گچھ ہونی ہے... اُس روز مسلم معاشرے کے غریبوں اور ناداروں کو جلوس نکالنے کی ضرورت نہیں تھی! غربت اور معاشی ناہمواریوں کا علاج تو خود اِس شریعت کے اندر ہے جو کہ اُس روز مسلم معاشرے کے اندر قائم تھی۔

*جس روز " وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ "ایک عبادت تھی اُس روز مسلم عورت اپنے 'حقوق' کے لیے سڑکوں پر خوار ہوتی نہیں پھر رہی تھی۔ کیونکہ سب حقوق اور سب سماجی ضمانتیں بدرجۂ اتم اس شریعت میں درج ہیں، جس کی لفظ بلفظ پابندی آپ سے آپ اللہ واحد قہار کی "عبادت" ہے!

عبادت کا معنی و مفہوم

تعریف

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عبادت ایک جامع لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ و محبوب ظاہری و باطنی اقوال و افعال کو شامل ہے، چنانچہ نماز، زکوۃ، روزہ، حج، سچائی، امانت کی ادائیگی، والدین سے حسن سلوک، رشتہ داروں سے نیکی، ایفائے عہد، نیکی کا حکم، برائی سے روکنا، کفار و منافقین سے جہاد، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور زیر دست انسانوں اور جانوروں کے ساتھ بھلائی، نیز دعا، ذکر، قرأت وغیرہ سب عبادات ہیں، اسی طرح اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اللہ کا ڈر، اس کی طرف رجوع، خالص اسی کی عبادت، اس کے حکم پر ڈٹ جانا، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا، اس کی قضاء و قدر پر راضی ہونا، اس پر توکل کرنا، اس کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف وغیرہ عبادات ہیں۔" (العبودیۃ: 8)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے عبادت کی جو تعریف بیان فرمائی ہے وہ نہایت جامع ہے۔ اس میں عبادت کی

تمام صورتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب و سنت میں عبادت کو اس کے مختلف پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے۔

ان میں ایک پہلو اللہ تعالیٰ کے لیے شعائر بندگی اور توحید کے اظہار اور شرک سے برأت والے اعمال کو بجا لانا ہے، جیسے دعا، ذبیحہ، نذر اسی طرح مشرکین سے برأت کرنا، نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنا وغیرہ۔ شعائر بندگی میں نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور دیگر شعائر آتے ہیں۔ انہیں اللہ کے سوا کسی اور کے لئے بجا لانا شرک ہے۔ عبادت کا یہ پہلو انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

عبادت کا دوسرا پہلو اطاعت و فرمانبرداری سے تعلق رکھتا ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں، ہر معاملے میں، ہر حوالے سے اللہ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے۔ عبادت کا یہ تصور انسان کی پوری زندگی کو عبادت بناتا ہے، یوں وہ اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرتا اور دنیا و آخرت کی بھلائیاں سمیٹتا ہے۔ عبادت کا یہ پہلو بھی دعوتِ انبیاء علیہم السلام کا بنیادی عنوان ہے۔

عبادت کے بنیادی ارکان

عبادت کے دو ارکان ہیں:

۱۔ اللہ کی بندگی کرنا

۲۔ جھوٹے خداؤں کی بندگی کا کفر

اللہ کی بندگی کرنا

عبادت کی اقسام

عبادت کی درج ذیل اقسام ہیں:

۱۔ قلبی:

یہ سب سے اہم عبادات ہیں، باقی تمام عبادات کا دار و مدار اسی دل کی عبادت پر ہے۔ جس کے دل کے اعمال جتنے بہتر ہوں گے اس کے ظاہری اعمال بھی اتنے بہتر ہوں گے اور جو یہاں جتنا کمزور ہو گا وہ اپنی ظاہرہ عبادات میں بھی اتنا ہی کمزور ہو گا۔ دل کی عبادت میں محبت، خوف، توکل، امید، خشیت، انابت جیسے اعمال داخل ہیں۔ ان اعمال میں محبت کو بنیادی مقام حاصل ہے، یہ عبادت کی اساس اور بنیاد ہے۔ البتہ یہ محبت جب تک خوف اور امید کے ساتھ جڑی نہ ہو تب تک یہ اللہ کے تقرب کا درست ذریعہ نہیں بنتی۔ اللہ صورتوں کو نہیں دلوں کو دیکھتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ) " مسلم: ۲۵۶۴)

"بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔"

تقویٰ کا اصل مرکز دل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ دل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا" :التَّقْوَى هَا هُنَا) "مسلم: ۲۵۶۴) تقویٰ اور پرہیزگاری یہاں ہے۔"

انسانی اعمال کے درست یا غلط ہونے کا دارومدار دل کے اعمال پر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"أَلَا وَإِنَّ فِي الجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ) ". بخاری ۵۲ مسلم ۱۵۹۹)

"بے شک بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ سنور گیا تو سارا بدن سنور گیا اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا بدن بگڑ گیا اور یاد رکھو وہ ٹکڑا دل ہے۔"

پس جب دل کے اعمال درست ہوں تو ظاہری، مالی، بدنی اور دیگر تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں اور اگر دل کی نیت ہی خالص نہ ہو تو ظاہری اعمال کی درستگی بھی کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ یہ بات ایک مومن کو بے حد خوفزدہ کرنے والی ہے کہ کہیں اس کا دل ایمان سے کفر کی جانب نہ پھر جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی طرح ہیں وہ انہیں جیسے چاہتا ہے پھیرتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللَّهُمَّ مُصَرِّفَ القُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ) "مسلم: ۲۶۵۴)

"اے اللہ! دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔"

اعضاء سے عمل کرنے کی ہمت یا مہلت نہ ہو تو تب بھی اللہ تعالیٰ دل کے عمل کو دیکھتے ہوئے ظاہری عمل کا ثواب دے دیا کرتا ہے: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ؛ مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ) "مسلم: ۱۹)

"جو شخص فوت ہو جائے اور اس نے جہاد نہ کیا ہو اور نہ جہاد کرنے کی نیت کی ہو تو وہ نفاق کی ایک خصلت پر فوت ہوا۔"

پس جس میں قتال کی طاقت نہ ہو تو اللہ اسے محض عزم کرنے پر اس عمل کا ثواب دے دیتا ہے، اسی لیے نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَنْ سَأَلَ اللهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ؛ بَلَّغَهُ اللهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلَى فِرَاشِهِ"

"جو شخص اللہ سے سچائی کے ساتھ شہادت مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کا درجہ دے گا اگرچہ اپنے بچھونے پر فوت ہو۔" (مسلم: ۱۹۰۹)

سچے دل سے سوال کرنا دل کا عمل ہے۔ دل کی نیت خراب ہو تو اللہ بڑے بڑے اعمال کے اجر سے محروم فرما دیتا ہے۔

۲۔ قولی:

زبان کے ساتھ اللہ کی تسبیح، تمجید، تہلیل اور تکبیر بیان کرنا، مشکلات میں اکیلے اللہ کو پکارنا، ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا، زبان سے کسی مسلمان کا دفاع کرنا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، دوسروں کو اذیت پہنچانے سے اپنی زبان کو روکے رکھنا۔ یہ سب زبان کی عبادات ہیں۔

۳۔ مالی:

اللہ کے نام پر نذر و نیاز، چڑھاوے اور سبیلیں لگانا۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا، دعوت و جہاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اسلام کے دفاع اور انسانیت کی بھلائی کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر پیسہ لگانا۔ یہ سب صورتیں مال کی عبادات ہیں۔

۴۔ بدنی:

اللہ کے سامنے جھکنا، قیام، رکوع، سجود اور طواف جیسی عبادات محض اللہ کے لئے بجا لانا۔ والدین کی خدمت، پڑوسیوں کے کام، بیواؤں اور یتیموں کی نگہداشت اور تربیت، مہمانوں کے اکرام، علم کے حصول اور جہاد و قتال کی خاطر اپنے بدن کو تکلیف دینا۔ یہ سب بدنی عبادات ہیں۔

۵۔ اطاعت:

اللہ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی تابعداری کرنا اور منع کردہ سے رکنا اللہ کی عبادت ہے۔ یہ اطاعت زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہے، پس اللہ کا حکم انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا خانگی امور سے، معاشرتی پہلو سے متعلق ہو یا ریاستی اور سیاسی حوالے سے، الغرض زندگی کے ہر پہلو میں رب العالمین کی مان لینا ہی

دراصل اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنا ہے۔ جو کوئی زندگی کے کسی حصہ میں اللہ کی مانتا ہے اور کسی حصہ میں اللہ کے سوا کسی اور سے ہدایت لیتا ہے اور اُس حصہ میں اللہ کے احکامات کو لائق اتباع نہیں جانتا وہ درحقیقت بیک وقت دو خداؤں پر ایمان رکھتا ہے یعنی اللہ کے ساتھ شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ پس مومن وہ ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں اللہ ہی کو لائقِ اطاعت مانے اور اس کے سوا کسی کو ہدایت دینے کا مجاز نہ ٹھہرائے۔

معبودانِ باطلہ کی بندگی کا کفر

زندگی کے کسی بھی میدان میں مخلوق کی بندگی کرنا کلمہ توحید کے منافی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار اور معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار انبیاء اور رسولوں کی بعثت کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ کوئی دوسری جزوی ذمہ داری یا مقصد انہیں ان کے اس بنیادی مقصد سے باز نہ رکھ سکا۔ یہی اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے جسے رسول لے کر آئے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جسے نماز، روزہ، زکوۃ، حج بیت اللہ اور دوسرے فرائض و نوافل سے بھی پہلے پورا کرنا ضروری ہے۔ جب تک معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار نہ کر دیا جائے اس وقت تک نہ تو اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان مکمل ہوتا ہے، نہ کوئی عمل قبول ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

{وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ} النحل: 36)

"ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا (جو انہیں یہی کہتا تھا) کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو پھر کچھ ایسے لوگ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی اور کچھ ایسے تھے جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ سو تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ طاغوت سے اجتناب کی دعوت دینا تمام پیغمبروں کی پہلی ذمہ داری تھی اور کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا:

{فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ} (البقرۃ: ۲۵۶)

"جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا، جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجی

جانے والی ہر چیز کا انکار کیا اس کا مال اور خون (مسلمانوں پر) حرام ہے اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔" (صحیح مسلم ۲۳۔)

لہٰذا ضروری ہے کہ ایمان کا اظہار کرنے سے پہلے معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار کیا جائے۔ اگر معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار کیے بغیر ہی ایمان کا اظہار کر دیا گیا تو ایسا ایمان اس وقت تک فائدہ نہیں دے سکتا جب تک معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار اور شرک سے اجتناب نہیں کیا جاتا۔ ایمان باللہ اور ایمان بالطاغوت دونوں کا کسی ایک آدمی کے دل میں اکٹھا ہونا ممکن نہیں خواہ ایسا ایک لمحے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ دونوں میں سے ایک پر ایمان دوسرے کی نفی کو مستلزم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی بندہ کے دل میں ایمان اور کفر جمع نہیں ہو سکتے۔" (سلسلہ الصحیحہ للألبانی: ۱۰۵۰)

اللہ تعالیٰ پر وہی ایمان قابل قبول ہو گا جس سے پہلے معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار کیا جائے ورنہ پھر معبودان باطلہ پر ہی ایمان ہو گا جس سے اللہ تعالیٰ پر ایمان کا انکار لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور معبودان باطلہ پر ایمان دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے یہ ایک وقت میں ایک چیز اور اس کی ضد کو اکٹھا کرنے کے مترادف ہے۔

ایک ایسا شخص جو لا الہ الا اللہ کا اقرار تو کرتا ہے لیکن معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار نہیں کرتا وہ ایک وقت میں دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کر رہا ہے جو کہ ایک ناممکن سی بات ہے۔ لا الہ کلمہ توحید کا ایک حصہ ہے گویا معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار خود اسی کلمہ میں ہی شامل ہے۔ اس لیے جو کلمہ توحید کا اقرار کرنے کے باوجود معبودان باطلہ کی بندگی کا انکار نہیں کرتا وہ ایسا ہے جیسے وہ ایک طرف تو یہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جبکہ دوسری طرف عملی طور پر وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی معبود ہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین توحید تھا۔ توحید کلمہ لا الہ الا اللہ کی معرفت اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا نام ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کلمہ کو تو سبھی لوگ پڑھتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ بعض لوگ اسے پڑھنے کے بعد اس کا صرف یہی معنی مراد لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی خالق و رازق نہیں، اس میں اس طرح کے دوسرے بھی کئی معانی شامل کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو اس کلمہ کے معنی اور مفہوم سے بالکل ہی ناواقف ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو اس کلمہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ قابل تعجب وہ شخص ہے جو ایک طرف اس کلمہ کو پہچانتا ہے اور دوسری طرف اس سے اور اس کے ماننے والوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ اس سے

بھی زیادہ قابل تعجب وہ ہے جو اس کلمہ سے محبت کرتا ہے اور اس کے ماننے والوں کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے لیکن اس کے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتا۔ سبحان اللہ! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک دین میں دو جماعتیں ہوں اور وہ حق پر ہونے کی دعویدار ہوں۔ اللہ کی قسم! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کچھ نہیں۔" (مجموعۃ الرسائل والمسائل النجدیۃ: ۳۳/۴)

اس شخص کے کافر و مرتد ہونے میں کسی قسم کا کوئی پہلو مخفی نہیں جو اسلام میں داخل ہونے اور کلمہ توحید کا اقرار کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ کیونکہ شرک تمام اعمال کو ضائع کر دینے کا باعث ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ} (الأنعام: ۸۸)

اور اگر وہ لوگ (یعنی انبیاء کرام) بھی شرک کرتے تو ان کا سب کیا کرایا ضائع ہو جاتا۔

اللہ کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کو حق مانے مگر اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی بجائے اپنے نفس یا کسی اور کی بندگی کرنے لگے یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود کو خدائی منصب پر فائز کرے اور اللہ کے بندوں سے اپنی بندگی اور غیر مشروط اطاعت کروائے۔ جو اس آخری مرتبے پر پہنچ جائے اس کا نام طاغوت ہے۔

جن چیزوں کی لوگ پوجا کرتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بے جان: جیسے پتھر کے بت، بعض درخت اور قبریں وغیرہ

۲۔ عاقل: جیسے انسان، جنّات اور فرشتے وغیرہ

عاقل کی دو قسمیں ہیں:

۱: وہ عاقل جو اپنی بندگی کروانے پر راضی ہیں۔ جیسے شیطان اور دیگر طواغید۔ یہ سب کافر اور جہنم میں جانے والے ہیں:

{وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ} (الأنبياء: ۲۹)

"ان میں سے اگر کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی الٰہ ہوں تو ہم اسے دوزخ کی سزا دیں گے ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔"

ب: وہ عاقل جو اپنی بندگی پر راضی نہیں، کچھ ہستیاں ایسی ہیں جو خود کو الٰہ بنائے جانے پر راضی نہیں جسے نصاریٰ عیسی علیہ السلام کو الٰہ کا درجہ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مشکلات کے حل کے لیئے پکارتے ہیں اور کچھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مدد کی فریاد کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دوسرے اولیاء اور صالحین کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ لوگ اگرچہ ان کی بندگی کرتے ہیں لیکن انبیاء اور صالحین اللہ کے فرمانبردار، اللہ کی بندگی کرنے والے اور اللہ کے علاوہ ہر کسی کی بندگی سے برأت کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی بجائے اپنی عبادت پر راضی نہیں اس لیے انہیں طاغوت کہنا جائز نہیں۔

جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی بندگی سے برأت کرتے ہوئے فرمائیں گے:

{ وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ } (المائدہ: ۱۱۶)

"اور جب (قیامت کے دن) اللہ فرمائے گا "اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو الٰہ بنالینا؟ عیسیٰ جواب دیں گے: "اے اللہ تو پاک ہے، میں ایسی بات کیونکر کہہ سکتا ہوں جس کا مجھے حق نہ تھا۔"

اسی طرح فرشتے اور نیک بندے بھی کہیں گے:

{ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ أَأَنتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ۞ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنبَغِي لَنَا أَن نَّتَّخِذَ مِن دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِن مَّتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا } (الفرقان ۱۸)

"اور جس دن اللہ انہیں اور جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں اکٹھا کرے گا تو ان سے سوال کرے گا کہ "کیا تم نے میرے بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود ہی راہ سے بہک گئے تھے؟" وہ کہیں گے: "تیری ذات پاک ہے ہماری مجال نہ تھی کہ تیرے سوا کسی کو کارساز بناتے، مگر تو نے انہیں اور ان کے آباء کو خوب دنیا کا سامان دیا، یہاں تک کہ وہ تیری یاد بھول گئے، یہ تھے ہی ہلاک ہونے والے"

معبودان باطلہ کی عبادت کے انکار کا طریقہ

یہ بات جان لینے کے بعد کہ معبودان باطلہ کی عبادت کا انکار لازمی امر ہے اور اس کے بغیر انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا، معبودان باطلہ کی عبادت کے انکار کے طریقوں کو جاننا بھی بہت ضروری ہے تاکہ عملی زندگی میں

اس کا اظہار کیا جا سکے۔ اس کا اگر صرف زبانی طور پر دعوی کیا گیا اور عملی زندگی میں اس کا کوئی اظہار نہ کیا گیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صادق آئے گا:

{ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ } (الصّف: ۳)

"اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں۔"

طاغوت سے کفر کے معنی یہ ہیں کہ طاغوت سے بیزاری کا اعلان کیا جائے اور اس کے گمراہ اور کافر ہونے کی گواہی دی جائے، اس سے نفرت کی جائے اگرچہ وہ طاغوت بھائی یا باپ کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں مگر قبروں اور مزاروں یا ان پر بنے ہوئے قبوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تو ایسا شخص لا الہ الا اللہ کی گواہی میں جھوٹا ہے نہ تو اس کا اللہ پر ایمان ہے اور نہ ہی اس نے طاغوت کا کفر کیا۔

۱۔ عبادت کا انکار کرنا:

ایک مومن اس عبادت کا انکار کرے جو اللہ کے سوا کسی کی ہو رہی ہو اور وہ یہ اعتراف کرے کہ عبادت کی ہر قسم صرف اللہ کا حق ہے۔

{ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ } (المومنون: ۲۳)

"یقینا ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم (اس سے) نہیں ڈرتے۔"

{ أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ } (الطور: ۴۳)

"کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟ (ہر گز نہیں) اللہ ان کے شرک سے پاک ہے۔"

۲۔ عبادت ترک کرنا:

کفر بالطاغوت کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ خود معبودان باطلہ کی عبادت کو ترک کرے اور اللہ اکیلے کی عبادت کرے۔

{ قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِيَ الْبَيِّنَاتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ } (المومن: ٦٦)

"آپ کہہ دیجئے! کہ مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، جبکہ میرے پاس واضح دلائل آچکے ہیں، مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ رب العالمین کا فرمانبردار بن کر رہوں۔"

{قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ﴿﴾ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ} (الزمر ٦٥)

"آپ ان سے کہئے جاہلو کیا تم مجھے یہ مشورہ دیتے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کروں؟ حالانکہ آپ کی طرف اور ان لوگوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے تھے یہ وحی کی جاچکی ہے کہ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے عمل برباد ہو جائیں گے اور آپ خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔"

۳۔ حق کا برملا اظہار کرنا:

کفر بالطاغوت اس صورت میں بھی ہو گا کہ حق کا برملا اعلان کرتے ہوئے اپنے عقیدہ و منہج کا کھل کر اظہار کیا جائے۔

{قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ} (یوسف ۱۰۸) "آپ کہہ دیجئے کہ میرا راستہ یہی ہے کہ میں اور میرے فرماں بردار پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اللہ کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔"

{لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ} (الکافرون: ٦)

"تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔"

۴۔ طاغوت کو کافر قرار دینا:

کفر بالطاغوت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں کافر قرار دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ} (الکافرون: ۱) "آپ کہہ دیجئے: اے کافرو!۔"

اللہ تعالیٰ نے طاغوت کی بندگی کرنے والوں کو بھی کافر کہا:

{قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ ۚ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿٠﴾ وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ} (المائدہ: ٦١)

"کہہ دیجئے! کیا میں تمہیں اللہ کے ہاں انجام کے لحاظ سے اس سے بھی بدتر انجام والے کی خبر دوں وہ لوگ جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان پر اس کا غضب نازل ہوا پھر ان میں سے بعض کو بندر اور سوّر بنا دیا جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی، یہی لوگ درجے کے لحاظ سے بدتر اور سیدھی راہ سے بہت بہکے ہوئے ہیں۔ اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ کہ جب وہ آئے تب بھی کافر تھے اور جب گئے تب بھی کافر اور جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اللہ خوب جاننے والا ہے۔"

{ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ﴿﴾ لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا ۖ وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ } (الانبیاء: ۹۹") تم اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، سب دوزخ کا ایندھن بنو گے، تم سب دوزخ میں جانے والے ہو۔ اگر یہ (سچے) معبود ہوتے تو جہنم میں داخل نہ ہوتے، اور یہ سب کے سب اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

اہل کتاب طاغوت پر ایمان رکھنے کی وجہ سے جہنم جائیں گے:

{ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿﴾ } (النساء: ۵۴، ۵۳)

"کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ علم دیا گیا ہے وہ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان ایمان والوں سے تو یہی لوگ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے آپ اس کا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔"

جبت سے مراد اعمال سفلیہ مثلا: جادو، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل جفر، فال گیری، ہاتھ کی لکیروں کا علم، علم نجوم، آگ پر چلنا اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔

طاغوت جو دراصل خدائی کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے:

{ وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ } (الأنبیاء: ۲۹)

"اور ان میں سے جو شخص کہے کہ اللہ کے علاوہ میں بھی الٰہ ہوں اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے اور ہم ظالموں کو ایسے ہی سزا دیتے ہیں۔"

۵۔ عداوت اور بغض رکھنا:

کفر بالطاغوت اس طریقے سے بھی ہوگا کہ ان سے اور ان کے معبودوں سے اپنی استطاعت کے مطابق

عداوت، بغض، براءت اور دشمنی کا اظہار کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ} (الممتحنة: ۴)

"تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھوں میں اچھا نمونہ ہے۔ جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو بیزار ہیں۔ ہم تمہارے منکر ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے (دشمنی) اور بیر پیدا ہو چکا حتیٰ کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔"

{مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ} (الفتح: ۲۹)

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت (مگر) آپس میں رحمدل ہیں۔"

{وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً} (التوبہ ۱۲۳") اور چاہیے کہ وہ (کفار) تم میں سختی پائیں۔"

مرتدین کے مقابلے میں جن مومنین کو اللہ تعالیٰ کھڑا کرے گا ان کی یہ صفت بیان کی جارہی ہے کہ:

{أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ} (المائدہ: ۵۴)

"وہ مسلمانوں پر نرم دل ہوں گے اور کافروں پر سخت ہوں گے۔"

۶۔ علیحدگی اختیار کرنا:

کفر بالطاغوت ان سے علیحدگی کرنے اور میل جول نہ رکھنے کی صورت میں بھی ہوگا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے فرمایا:

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ} (مریم: ۴۸)

"میں آپ کو چھوڑتا ہوں اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (مریم: ۴۹)

"پھر جب ابراہیم نے انہیں چھوڑ دیا اور ان کو بھی جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے تو ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطا فرمائے، اور ان سب کو ہم نے نبی بنایا۔"

۷۔ قتال کرنا:

کفر بالطاغوت استطاعت ہونے کی صورت میں ان کے خلاف جہاد کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے { : الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا } النساء : (۷۶)

"جو لوگ ایمان لائے وہ تو اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ سو ان شیطان کے دوستوں سے خوب جنگ کرو یقینا شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے۔"

{ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ } (التوبہ : ۱۲)

"تم کفر کے ان علمبرداروں سے جنگ کرو۔ ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں۔"

۸۔ محبت اور دوستی نہ رکھنا:

کفر بالطاغوت کا لازمی خاصہ یہ بھی ہے کہ ان سے دوستی اور محبت نہ رکھی جائے، ان کی طرف میلان نہ رکھا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ } (النساء : ۱۴۴)

"اے ایمان والو! کافروں کو دوست نہ بناؤ۔"

{ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ } (المائدہ : ۵۱)

"جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں سے ہو گا۔"

{ لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ } (المجادلۃ : ۲۲)

"اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت رکھتے ہوئے ہر گز نہ پائیں گے۔"

{ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ } (ہود : ۱۱۳)

"نہ ہی ان لوگوں کی طرف جھکنا جنہوں نے ظلم کیا ورنہ تمہیں بھی آگ آلے گی پھر تمہیں کوئی سرپرست نہ ملے گا جو تمہیں اللہ سے بچا سکے نہ ہی تمہاری مدد کی جائے گی۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہ {تَرْكَنُوْا} کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اس کا مطلب ہے {وَلَا تَمِيْلُوْا} یعنی تم ان کی طرف مائل نہ ہونا۔" (تفسیر ابن کثیر)

کفر بالطاغوت کے یہ طریقے ضرور اختیار کیے جانے چاہئیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی طواغید کے لیے اپنی دوستی اور محبت کو فراخ کر دے، ان کی طرف مائل ہو جائے، ان کا دفاع کرے، ان کے لیے قرآن و حدیث کے احکام میں تاویل کرے، ان سے دشمنی رکھنے والے اہل توحید کے مقابلے میں طواغید کی مدد کرے، اس کے باوجود بھی وہ شخص یہ خیال کرے کہ وہ کفر بالطاغوت کر رہا ہے؟ ایسا شخص کبھی بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا اور طاغوت سے کفر کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ بڑی عجیب بات ہے جس پر جتنا بھی تعجب کیا جائے کم ہے کہ کوئی طاغوت کا حمایتی بھی ہو اور اس سے کفر کرنے کا دعویدار بھی ہو۔ کیونکہ دل سے جہاد کرنا ایمان کا آخری درجہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھیجے۔ اس کے حواری اور ساتھی ہوتے تھے جو اس کے حکم کی پیروی اور اس کی سنت پر عمل کرتے پھر ایسے ناخلف پیدا ہوئے جو ایسی بات کہتے جو وہ کرتے نہیں تھے اور وہ کام کرتے تھے جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ پس جو شخص ان سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے۔ جو شخص ان سے زبان سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے۔ جو شخص ان سے دل سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے۔ اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔" (صحیح مسلم 179)

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. عبادت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟ وضاحت کریں۔
2. عبادت کی کتنی اقسام ہیں، اور ہر ایک کی مختصر وضاحت کریں؟
3. اسلام میں عبادت کی مختلف صورتیں کون سی ہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کریں۔
4. عبادات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتی ہیں؟ تفصیل سے بیان کریں۔
5. قرآن مجید میں عبادات کی تاکید کیسے کی گئی ہے؟ کم از کم دو آیات کے حوالے سے وضاحت کریں۔

یونٹ نمبر: 05

قرآن کریم اور اسوہ حسنہ

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کے مقاصد 71
قرآن کریم اور اسوہ حسنہ 72
خود آزمائی 84

یونٹ کا تعارف

قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو بہترین اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں کی آیات کی روشنی میں یونٹ ہذا کو جزیئات وامثال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے. اس یونٹ میں اسوہ حسنہ کا مفہوم، اس سے استفادہ اور نتائج پر بحث کی گئی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ اسوۂ حسنہ کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم جان سکیں۔

2۔ اسوۂ حسنہ کو قرآنی پیرائے میں جان سکیں۔

3۔ اسوۂ حسنہ کی قرآنی آیات کی تفسیر جان سکیں۔

4۔ انسان کے لیے اسوۂ حسنہ کی اہمیت جان سکیں۔

قرآن کریم اور اسوہ حسنہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے''

اسوہ کے لفظ کا مادہ ''اس و'' ہے. اُسوہ اور اِسوہ دونوں اس کے تلفظ ہیں. جس طرح قُدوہ اور قِدوہ دونوں ہم معنی ہیں' اسی طرح لفظ اُسوہ اور اِسوہ دونوں استعمال ہوتے ہیں' اور اس کا معنی و مفہوم ہے کسی کا اتباع کرنا' اور اس اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لینا' خواہ اس میں کوئی تکلیف ہو خواہ مسرت. چنانچہ کسی کے اتباع کو اپنے اوپر مسرت و راحت اور تکلیف و مضرت دونوں کیفیات میں لازم کر لینا اسوہ ہو گا. اردو میں جب اس لفظ کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا جائے گا تو ''نمونہ'' اس کے قریب ترین مفہوم کا حامل ہے' لیکن اس ترجمے سے ''اسوہ'' کا حقیقی مفہوم ادا نہیں ہوتا. اصل میں ''اتباعِ سنت'' کی جو اصطلاح ہمارے ہاں زیادہ معروف ہے اسی کی ایک نہایت حسین و جمیل تعبیر لفظ اسوہ میں موجود ہے.

یہاں ''لَكُمْ'' (تمہارے لیے) عام ہے. گویا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں ہیں' بلکہ تا قیامِ قیامت تمام مسلمانوں کے لیے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیاتِ طیبہ ایک اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے. آگے فرمایا: لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾

جناب محمد رسول اللہ ﷺ پوری نوع انسانی کے لیے بھی مجسم ہدایت ہیں. آپ ﷺ کے لیے قرآن مجید میں لفظ نور آیا ہے' بایں معنی کہ آپؐ نورِ ہدایت' شمع ہدایت اور سراجاً منیراً ہیں. اسی طرح قرآن مجید آپؐ کو رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے. بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ قرآن مجید کتابِ متلو ہے اور نبی اکرم' ﷺ قرآنِ مجسم ہیں جیسا کہ آپؐ کی وفات کے بعد چند لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپؐ کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ

اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنی کتاب کے ساتھ رسول بھیجا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تنہا کتاب بغیر کسی رسول کے آئی ہو، حالانکہ اس کے برعکس یہ نہ صرف یہ کہ ممکن ہی ہے بلکہ عملی واقعہ بھی ہے کہ کوئی رسول، اپنی پیغمبرانہ زندگی میں، رسول ہونے کے باوجود، ایک مدت تک محرومِ کتاب ہی رہا ہو اور منصبِ نبوت پا لینے کے ایک مدت بعد اسے کتاب ملی ہو- کیوں اس نے یہ ضروری جانا کہ کتاب کے ساتھ ایک رسول بھی بھیجا جائے؟ اور پھر رسول جب بھی بھیجا گیا تو کوئی فرشتہ نہیں، بلکہ انسانوں ہی میں سے بھیجا گیا- آخر یہ کیوں؟__

اس کی وجہ یہ ہے کہ تنہا کتاب خواہ وہ کتنی ہی عظیم الشان ہوتی، بہر حال وہ الفاظ ہی پر مشتمل ہوتی جبکہ عملاً جو کچھ مطلوب ہوتا ہے، وہ الفاظِ کتاب نہیں بلکہ معانی کتاب ہوتے ہیں، جن کے تعین میں لامحالہ (اگر کتاب کے ساتھ رسول نہ ہو تو) لوگوں میں سے ہر فرد دوسرے سے مختلف ہوگا اور یہ اختلافِ معانیٔ کتاب لوگوں کو نہ تو بنیانِ مرصوص ہی بنا سکے گا نہ ہی انہیں اقامتِ کتاب (یا غلبہ دین) کی منزل تک پہنچا سکے گا۔ مگر رسول کی موجودگی میں کتاب کا وہی مفہوم 'سرکاری فرمان' قرار پائے گا جو خود رسول کا پیش کردہ ہو، کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ خدا کا مامور من اللہ نمائندہ ہے بلکہ اس کتاب کا شارح مجاز بھی ہے۔ لیکن کتاب کی ایسی توضیح و تشریح جو صرف بیان و کلام کی حد تک ہو، وہ تو خیر ایک فرشتہ بھی کرسکتا ہے لیکن جو تشریح و وضاحت عملی مظاہرہ (Practical Demonstration) کی محتاج ہو وہ کوئی فرشتہ اس لئے انجام نہیں دے سکتا کہ اس کی دنیا انسانی دنیا سے یکسر مختلف ہے اور انسان سے قطعی الگ اور جداگانہ مخلوق ہونے کی بنا پر وہ انسان کے لئے نمونۂ پیروی نہیں بن سکتا۔ انسانوں کی دنیا میں تو کوئی انسان ہی اُن کے لئے اُسوۂ حسنہ بن سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے کتاب کے ساتھ کسی فرشتہ کی بجائے انسان ہی کو رسول اور راہنما بنا کر بھیجا ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا سوال یہ ہے کہ 'اُسوۂ حسنہ' کا محل وہبط کیا ہوگا؟ کتاب یا رسول؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے صرف دو ہی رسولوں کو اہل ایمان کے لئے بالصراحت اُسوہ حسنہ قرار دیا ہے: ایک حضرت محمد ﷺ اور دوسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو کتاب (جسے قرآن نے 'صحفِ ابراہیم' کہا ہے) دی گئی تھی، وہ آج مسلمان تو کیا کسی بھی قوم کے پاس نہیں ہے۔ سو اگر اُسوہ کا مقصد (یا منکرین حدیث کی زبان میں اطاعت رسول کا مقصد) کتاب ہی کی پیروی ہوتا تو پھر آج اُسوۂ ابراہیمی کہاں سے لیا جاتا؟!! خود قرآن مجید نے بھی صحفِ ابراہیم کے الفاظ و متن کو اپنے دامن میں محفوظ نہیں رکھا، بلکہ اس کی بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعمالِ حیات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور انہی اعمال کی بنیاد پر وہ آج بھی اُمتِ مسلمہ کے امام اور ملتِ ابراہیمی کے بلند پایہ قائد قرار دیئے گئے ہیں—اس سے یہ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے نقوش و الفاظ اُسوہ نہیں بن سکتے۔ بلکہ اسکے حامل رسول کے اعمالِ حیات، نقوشِ قدم ہی اُسوہ بن سکتے ہیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ محض نظریاتی تعلیم کسی قوم کی اصلاح کے لئے کافی نہیں ہوا کرتی۔ اصلاح کا فطری طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ایک عملی مثال قائم کی جائے جس کی وہ اتباع کر سکیں۔ اسی طرح محض نظریاتی تعلیم کسی شخص کو کسی علم جن کا ماہر نہیں بنا سکتی تاوقتیکہ اس کے ساتھ ساتھ اس علم یا فن کے کچھ اچھے ماہر کے زیر تربیت نہ رہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص میڈیکل سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا ہو لیکن وہ کسی

تجربہ کار ڈاکٹر کی نگرانی میں کام نہیں کرتا تو کتابوں کے بھرپور مطالعے کے باوجود وہ ڈاکٹری کی خدمات انجام نہیں دے سکتا اور نہ ایسے شخص کو مریضوں کی جانوں سے کھیلنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔اگر کوئی صاحب قانون کے طالب علم ہوں تو جب تک وہ کسی ماہر اور سینئر قانون دان سے اس کام کی عملی تربیت حاصل نہیں کر لیتے اور وہ ایک معتدبہ وقت اس کی ماتحتی میں نہیں گزار لیتے وہ ایک قانون دان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ہی بھیجی گئی۔اس کا سبب بالکل واضح ہے۔انسانیت کو صرف ایک آسمانی کتاب کی ضرورت نہ تھی بلکہ اسے ایک معلم کی بھی ضرورت تھی جو کتاب کے مندرجات کی تعلیم بھی دے سکے۔اسے ایک مربی کی بھی حاجت تھی جو انسانوں کو تربیت دے سکے اور جو ان کے لئے ایک ایسا عملی اسوۂ حسنہ قائم کر سکے۔جس کے بغیر وہ اپنی عملی زندگی میں کتاب سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ اسی لیے نبی بنا کر امت کے درمیان بھیجے گئے تاکہ آپ ﷺ عملی زندگی کی ایک مثال قائم کریں اور اپنے شب و روز کی زندگی خواہ وہ خلوت ہو یا جلوت، داخلی امور ہوں یا خارجی، شخصی مسائل ہوں یا ملی حالات، اب سب امور میں اپنا ایک اسوۂ حسنہ رہتی دنیا تک کے لیے چھوڑیں؛ تاکہ ساری انسانیت کے لیے آپ ﷺ کا طرزِ زندگی حجت بنا رہے؛ اسی حقیقت کو قرآن نے ایک جگہ یوں بیان فرمایا:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ (الاحزاب:۲۱) ترجمہ: تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین عملی نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہر کار خیر میں نمونہ ٹھہرے تو اب مومن کا ہر کام رسول مقبول ﷺ کی تابعداری سے مشروط ہو گیا، نماز و زکوۃ کی ہر ادا عمل رسول اور حکم رسول کے تحت آ گئی، نماز کا طریقہ اور زکوۃ کا نصاب کسے معلوم تھا؟ ان احکام پر عمل کی راہیں کس مسلمانوں کو معلوم تھیں؟ ظاہر ہے کسی کو معلوم نہ تھیں، یہ عمل رسول اور حکم رسول ہی تھا جسے نماز اور زکوۃ کو لائق عمل بنایا، اطاعت رسول کے بغیر یہ دونوں حکم ناقابل عمل تھے، اس لیے نماز اور زکوۃ کے ساتھ اطاعت رسول کی ہدایت کی گئی۔ "وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ"۔ (النور:۵۶) ترجمہ: اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رسول کی فرمانبرداری کر؛ تاکہ تم پر مہربانی ہو۔

یہاں اطیعوا اللہ کا ذکر نہیں، اللہ کے دو حکم نماز اور زکوۃ کے مذکور تھے، ان پر عمل کی راہ بجز اطاعت رسول کے کوئی نہ تھی، اس لیے اس آیت میں صرف اطیعوا الرسول کہا؛ تاکہ نماز اور زکوۃ کی راہ تمھیں معلوم ہو جائے معلوم

ہوا جس طرح نماز وزکوۃ خدا کے حکم ہیں، اطاعت رسول بھی اسی طرح بالاستقلال ایک حکم ہے۔

اسوہ رسول اور صحابہ کرامؓ:

آیت "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اپنے عموم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کو شامل ہے اور آپ ﷺ اپنے تمام اقوال واعمال میں ہمارے لیے عمدہ نمونہ ہیں، اس پر صحابہ کرامؓ اور اکابر تابعین کی نہایت عمدہ شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں۔

۱۔ حضرت قتادہؒ (۱۱۸ھ) کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، یمنی چادر کے استعمال سے منع کرنا چاہا، ایک شخص نے کہا: کیا اللہ تعالی نے نہیں فرمایا "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" فرمایا: کیوں نہیں؟ (آپ اس کپڑے کو کسی اور مصلحت سے منع کرنا چاہتے تھے یہ نہیں کہ اسے ناجائز سمجھتے تھے) اس پر آپ نے اس ارادے کو ترک فرمادیا۔ (مصنف عبدالرزاق: ۳۸۲/۱، حدیث نمبر: ۱۴۹۳)

۲۔ یعلی بن امیہ حنظلی صحابی کہتے ہیں: میں عمرؓ کے ساتھ طواف کررہا تھا، آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا، میں بیت اللہ کی جانب تھا اور حضرت عمرؓ میرے ساتھ ساتھ تھے جب ہم رکن غربی کے پاس پہنچے تو میں نے آپ کا ہاتھ کھینچا کہ آپ رکن غربی کا استلام کریں، آپ نے پوچھا تجھے کیا ہوا، میں نے کہا: کیا آپ استلام نہیں کریں گے؟ آپؓ نے فرمایا: کیا تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف نہیں کیا؟ میں نے کہا: کیوں نہیں؟ انہوں نے کہا کہ تو نے آپ کو ان غربی رکنوں کا استلام کرتے دیکھا؟ میں نے کہا نہیں آپؓ نے فرمایا: "اليس لك في رسول الله ﷺ حسنة ؟ قلت : بلى، قال : فابعد عنك"۔ ترجمہ: کیا تمہارے لیے حضور ﷺ کی ذات گرامی میں اسوۂ حسنہ نہیں؟ میں نے کہا کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: پھر اس سے دور رہو۔ (مصنف عبدالرزاق: ۴۶۰/۸۔ مسند احمد، حدیث یعلی بن امیۃ، حدیث نمبر: ۱۷۹۸۰، صفحہ نمبر: ۲۲۲/۴، شاملہ)

۳۔ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے زیادہ قرآن سمجھنے والا کون ہوگا، آپ سے زیادہ قرآن کریم کے سیاق وسباق پر کس کی نظر تھی، آپ نے جب یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ اگر کوئی شخص قسم کے ساتھ اپنے اوپر وہ چیز حرام کرے جو اللہ نے اس کے لیے حرام نہیں فرمائی تو اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا، یہ کفارۂ یمین ہے، وہ چیز اس پر حرام نہ ہوسکے گی، اس پر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ (بخاری: ۷۲۹/۲)

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ سفر میں تھے، آپ نے بعض لوگوں کو سفر میں سنتیں پڑھتے دیکھا، آپ نے پوچھا یہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ عرض کیا گیا سنتیں پڑھ رہے ہیں، آپ نے کہا: اگر تم کو سنتیں پڑھنی ہوتیں تو فرض نماز میں قصر کا حکم کیوں ہوتا؟۔ فرمایا ترجمہ: میں نے حضور ﷺ کے ساتھ سفر حج کیا ہے، آپ دن کو سنتیں نہ پڑھتے تھے، میں نے حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ بھی حج کیا ہے، آپ بھی دن کو سنتیں نہ پڑھتے، میں نے حضرت عمرؓ کے ساتھ حج کیا، وہ بھی دن کو سنتیں نہ پڑھتے تھے، میں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ بھی حج کیا، وہ بھی دن کو سنتیں نہ پڑھتے تھے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ (مصنف عبدالرزاق: ۲/۵۵۷)

۵۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں ہم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مسئلہ پوچھا کہ اگر کسی شخص نے عمرہ میں بیت اللہ شریف کا طواف تو کرلیا؛ لیکن صفا مروہ کی سعی نہ کی، کیا وہ حلال ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں حضور ﷺ نے طواف کے بعد دو رکعت پڑھیں اور ساتھ ہی صفا و مروہ کی سعی کی؛ پھر آیت باری: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کی تلاوت فرمائی۔ (بخاری، باب قول اللہ تعالی واتخذوا من مقام، حدیث نمبر: ۳۸۱)

۶۔ ایک شخص نے حجر اسود کے بوسہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا، آپ نے فرمایا: میں نے آنحضرت ﷺ کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے، اس نے پوچھا اگر ہجوم زیادہ ہو بھیڑ ہو اور استلام مشکل ہو تو؟ آپ نے فرمایا: ترجمہ: اگر وگر کو تو یمن میں پھینک، میں نے تو حضور اکرم ﷺ کو حجر اسود کا استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے۔ (بخاری، باب تقبیل الحضر، حدیث نمبر: ۱۵۰۷)

۷۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا گیا، ایک شخص نے نذر مانی کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھے گا، اتفاق سے اس کے بعد فوراً عید آگئی کیا وہ عید کے دنوں میں روزہ رکھے، آپ نے فرمایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید کا روزہ نہ رکھتے تھے، نہ اسے پسند فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس موقعہ پر پھر یہ آیت تلاوت فرمائی "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ (بخاری: ۱/۲۹۲)

۸۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا: حجر اسود کو بوسہ دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں، میں نے اگر حضور ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے ہر گز

بوسہ نہ دیتا۔ (صحیح بخاری: ۲۱۸/۱)

اس قسم کی متعدد مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ و تابعین نے اس آیت کو کسی ایک واقعہ یا صورت حال سے خاص نہیں کیا؛ بلکہ اسے آنحضرت ﷺ کی جملہ تعلیمات وہدایات کے لیے ایک کلیدی آیت سمجھا ہے، آپ ﷺ کی ساری شریعت اور جملہ اوامر ونواہی اس آیت کے تحت امت کے لیے ایک عمدہ نمونہ عمل ہیں، صحابہ کرامؓ نے آنحضرت ﷺ کے ایک ایک عمل کو اپنے لیے دلیل قرار دیا ہے کیونکہ پیغمبر کی ذات ہر قانونی باب Legal Position میں امت کے لیے سند ہے؛ پیغمبر خدا کی ہر بات مانے بغیر صرف اسلامی نظام کی تکمیل نہ ہوگی، بلکہ پیغمبر خدا کی ہر بات اصولاً تسلیم کئے بغیر ایمان بھی قائم نہیں رہتا، پیغمبر خدا کی ہر بات کو حجت اور سند تسلیم کرنا صرف ایک نظام کی تکمیل ہی نہیں، تقاضائے ایمان بھی ہے اور اس کا اصولاً اقرار نہ کرنا کفر ہے، آپ حضور ﷺ کی تعلیمات کو حجت اور سند نہیں مانتے تو آپ مسلمان نہیں رہ سکتے، آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کو حجت اور سند ماننا اساس ایمان ہے اور اس کے بغیر آخرت میں کسی کی نجات نہیں، پس آپ کی Obedience محض ایک حاکم کی پیروی اور اطاعت نہیں، اس سے مختلف ہوگی، ایک حاکم کی تعمیل احکام محض ایک انتظامی مسئلہ ہے؛ مگر پیغمبر خدا ﷺ کی تعمیل ارشاد ایک ایمانی مسئلہ بھی ہے۔ جس سے اصولاً منہ پھیرنا کفر ہوگا۔

لیکن آپؐ کے اس اُسوہ نور اور شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرنے کے لیے بھی چند شرائط کو پورا کرنا لازم ہے. اگرچہ آپؐ اپنی جگہ شمع ہدایت ہیں اور جو چاہے آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کرلے، لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں. ان شرائط کو یہاں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾

''ہر اُس شخص کے لیے (نبی اکرم: ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اعلیٰ وارفع نمونہ ہے) جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے''.

آیت کے اس حصے میں دو چیزیں جمع ہو گئی ہیں. ایک ایمان باللہ اور دوسرا ایمان باالآخرۃ. ہمارے دین کے تین بنیادی ایمانیات ہیں، جو گویا تین Pillars of Faith ہیں) .۱ (ایمان باللہ یا توحید) ۲ (ایمان باالآخرہ یا معاد، اور) ۳ (ایمان بالرسالت. ایمان بالرسالت سے نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعلق ہے. یہ ایمانیات ثلاثہ باہم گتھے ہوئے ہیں. اگر کسی انسان کا اللہ پر ہی یقین نہیں یا اس میں شرک شامل ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اپنے لیے نمونہ کیسے بنالے گا۔ اور اگر اسے آخرت کا یقین نہیں تو پھر وہ آنحضرت ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی

کیسے کرے گا۔ یہ پہلی دو چیزیں ہوں گی تو تیسری بات کا امکان پیدا ہو گا. یعنی وہ شخص جو اللہ سے غافل ہو یا کبھی کبھار یا اتفاقاً اللہ کا نام لینے والا ہو' اور جو اللہ سے ملاقات کی حقیقی امید دل میں نہ رکھتا ہو' اسی طرح جس شخص کو یوم آخرت اور محاسبۂ اُخروی کی کوئی توقع نہ ہو' گویا جو ان دو ایمانیات سے تہی دست ہو' اس کے لیے آنحضرت ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتی. آنحضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع وہی شخص کر سکے گا جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا امیدوار بھی ہو اور جس کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہو کہ آخرت ہونے والی ہے' جہاں کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی بات پر ہو گا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا طرزِ عمل اور رویہ اللہ کے رسول ﷺ سے کس درجے قریب تر رہا ہے. لہٰذا بات صاف کر دی گئی کہ :

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا ﴿۲۱﴾

اس پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس شخص کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی اس کا اتباع کر سکے گا اور وہی آپ ﷺ کے نقش قدم پر چل سکے گا جو اللہ کا طالب ہو اور جو آخرت میں سرخروئی چاہتا ہو اور جو کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے والا ہو. یہاں رجاء کا جو لفظ آیا ہے وہ نہایت لطیف ہے. اس میں طالب ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے' اور اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہونے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے جس کی وضاحت وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ سے مزید ہو گئی. یہاں امیدواری میں اللہ کی رحمت' اللہ کی شفقت' اللہ کی نظر عنایت کے جملہ مفاہیم شامل ہیں. جیسے سورۃ الکہف کی آیت ۲۸ میں فرمایا : اَلَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِيِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ'' وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام' اپنے ربّ کے چہرۂ انور کے طلبگار بن کر'' وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالبین ہیں.

یہاں فرمایا : لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ جو اللہ کی رضا کا امیدوار ہے اور جو یومِ آخرت میں سرخروئی کی توقع رکھتا ہے'' گویا اسے یقین ہے کہ یہ دن آ کر رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلے ہو کر رہیں گے .وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا اور وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو کثرت کے ساتھ .'' یعنی وہ ہر کام اور معاملے میں اللہ کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام و اہتمام کرتا ہو اور زبان و قلب سے بھی اللہ کو یاد کرتا ہو. وہ اس بات کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ قلب و شعور میں مستحضر رکھتا ہو کہ اسے یوم آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی اس دُنیوی زندگی کا حساب دینا ہے. یہ تین شرطیں پوری ہوں گی تو اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کسی درجے عمل پیرا ہونے کا امکان پیدا ہو گا.

اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے والوں کا رویہ کیا ہوتا ہے اور ان کے طرزِ عمل میں کیا فرق واقع ہوتا ہے ! لیکن قرآن حکیم میں آپ کو یہ اسلوب عام ملے گا کہ استدلال کی کڑیوں کو بسااوقات اس طرح نمایاں نہیں کیا جاتا جس طرح ہم نمایاں کرتے ہیں کہ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا یا یہ نکلنا چاہئے. جیسے ہم کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے اِس اسوۂ حسنہ کی کامل مثال دیکھنی ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگیوں کو دیکھو جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں. یہاں یہ بات کہے بغیر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ان الفاظ میں ذکر فرمادیا گیا:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا ہٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ۫ وَمَا زَادَھُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ﴿۲۲﴾ ''اور حقیقی مؤمنوں کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی. اور اس صورت حال نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھادیا''.

یہ اسوۂ حسنہ کیا ہے جس کا اس سورۃ الاحزاب میں ذکر کیا گیا ہے ؟اسے ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہو گا۔ الغرض نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہر اعتبار، ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اکمل واتم ہے حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو اللہ کا نازل کردہ قرآن حکیم ہے اور دوسرا عظیم معجزہ خود نبی اکرم ﷺ کی اپنی ذات اور شخصیت ہے اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے اس قدر گھمبیر اور اتنی ہمہ گیر زندگی گزاری ہے کہ ہمارے ہوش اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں آتی یہ بھی خاصہ نبوت ہے اور یہ صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے اعتبار سے ایک اسوۂ کامل ہیں. لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن مجید میں جب یہ لفظ'' اس-وۃٌ حسنۃٌ ''آیا ہے :

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ﴿۲۱﴾ وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا ہٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ۫ وَمَا زَادَہُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاہَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ ۚ فَمِنْہُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْہُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ ۟ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ﴿۲۳﴾ لِّیَجْزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِہِمْ وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْہِمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۲۴﴾ وَرَدَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِغَیْظِہِمْ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا ؕ وَ کَفَی اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیْزًا ﴿۲۵﴾ وَ اَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاہَرُوْہُمْ مِّنْ اَہْلِ الْکِتٰبِ مِنْ

صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿۲۶﴾ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿۲۷﴾ (آیات ۲۱تا۲۷)

تو کس سیاق و سباق اور سلسلۂ عبارت (context) میں آیا ہے اور اس حوالے سے آپؐ کا اصل اور خصوصی اُسوہ کون سا ہے! یہ اسوۂ حسنہ وہ ہے جو ہمیں غزوۂ احزاب میں نظر آتا ہے. وہ صبر و ثبات' اللہ کے دین کے لیے سرفروشی و جان فشانی کہ جان نثاروں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہر مشقت میں آپ ﷺ بھی شریک تھے. کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اٹھائی ہو اور آپ ﷺ نے نہ اٹھائی ہو. یہ نہیں تھا کہ کہیں زرنگار خیمہ علیحدہ لگا دیا گیا ہو' جہاں قالین بچھا دیئے گئے ہوں اور وہاں حضور ﷺ آرام فرما رہے ہوں اور مور چھل جھلے جا رہے ہوں جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم خندق کھودنے کے لیے کدالیں چلا رہے ہوں. بلکہ معاملہ یہ تھا کہ خندق کھودنے والوں میں آپ' ﷺ بھی شامل ہیں. کدالیں چلاتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیک آواز کہہ رہے ہیں : اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلاَّ عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ اور نبی اکرم ﷺ ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر فرما رہے ہیں :فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ .یعنی سردی اور بھوک کی تکالیف اٹھانے میں آپؐ برابر کے شریک ہیں. اس خیال سے کہ بھوک اور نقاہت سے کہیں کمر دہری نہ ہو جائے' صحابہ کرام نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں. ایک صحابی ؓ حضور ﷺ کو اپنے پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں ۔

اس ''اُسوہ'' کی چھاپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں پر جو پڑی تو کیفیت یہ ہو گئی کہ جب انہوں نے ان لشکروں کو دیکھا جو اُمڈ اُمڈ کر اِدھر سے بھی آ رہے تھے اور اُدھر سے بھی آ رہے تھے تو وہ خوفزدہ نہیں ہوئے' بلکہ وہ کہنے لگے کہ یہ حالات تو پیش آنے والے تھے' جن کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول' ﷺ نے وعدہ کیا تھا. خیبر سے کیل کانٹے سے لیس یہودیوں کے لشکر بھی آ گئے. مکہ سے ابوسفیان ایک لشکر جرار لے کر آ گئے.

مشرق سے غطفان کے قبائل آ گئے. آیت نمبر ۱۰ میں ان تمام حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر آیت نمبر۱۱ میں فرمایا گیا :ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالاً شَدِیْدًا یہ وہ وقت تھا جب اہل ایمان خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے''. یہ نہایت کڑا امتحان تھا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے صبر و ثبات کا۔ یہ آزمائش تھی ان کی استقامت اور استقلال کی! سردی کا موسم تھا. پھر ہر چہار طرف سے حملہ آوروں کے لشکر پر لشکر جمع ہو گئے

تھے جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مسلمان خندق کے اِس پار محصور تھے. دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ برابر خبریں مل رہی تھیں کہ مدینہ کے باہر جنوب مغرب میں بنو قریظہ کا جو یہودی قبیلہ آباد تھا اور جس سے معاہدہ تھا کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے' وہ ساتھ دینے کے بجائے نقضِ عہد پر تلے بیٹھے ہیں' اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ پیچھے سے کب مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں' جہاں نہ صرف دفاع کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ مدینہ میں صرف خواتین اور بچے موجود تھے. ان حالات میں اہلِ ایمان کی کیفیات کیا تھیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکلے! یہ کہ :

قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

''انہوں نے کہا کہ اسی کا تو وعدہ کیا تھا اللہ نے اور اس کے رسول ﷺ نے اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا''.

تعین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان مؤمنین صادقین کے اس قول کے وقت قرآن مجید کا کون سا مقام اور کون سی آیت ان کے سامنے ہو گی ویسے قرآن حکیم میں یہ مضمون مختلف اسالیب سے بار بار آیا ہے کہ ہم اہل ایمان کا امتحان لیتے ہیں' ہم انہیں آزماتے ہیں' ہم ایمان کے دعوے داروں کو آزمائیں گے. سورۃ العنکبوت' جو مکی سورت ہے' اس کے پہلے رکوع میں یہ مضمون خوب واضح طور پر آیا ہے اور یہ رکوع ہمارے منتخب نصاب میں بھی شامل ہے. فرمایا:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (آیات : ۲' ۳)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں. اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں''

پھر سورۃ البقرۃ جو مدنی سورت ہے' کی آیت ۲۱۴ میں بھی اسی طرح کا مضمون ذکر فرمایا ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات کے ذریعے آزمائش و امتحان سے گزارنے کی اس سنت ثابتہ سے

اہل ایمان کو بہت پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو آزمائش و ابتلاء کی بھٹیوں سے گزارا جائے گا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کی کیفیات سے ان آیات کے ذریعے اہل ایمان کو پیشگی مطلع کر دیا گیا تھا ۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کے پس منظر میں یہ آیات بہت نمایاں ہیں ۔ اہل ایمان کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ شعوری طور پر جانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے کہ سخت سے سخت آزمائشیں' امتحانات اور ابتلاء ات آنے والے ہیں۔ شخصی طور پر "یومِ طائف" نبی اکرم ﷺ کے لیے سب سے کٹھن اور سب سے سخت دن تھا ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب دریافت کیا کہ آپ ﷺ پر یومِ اُحد سے زیادہ کوئی سخت دن گزرا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں' مجھ پر جو سخت ترین دن گزرا ہے وہ یومِ طائف تھا" ۔ چنانچہ شخصی اعتبار سے حضور کے لیے یوم طائف ابتلاء و آزمائش کا نقطۂ عروج (climax) ہے' جبکہ بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کے لیے غزوۂ احزاب آزمائش کی چوٹی ہے جس کا نقشہ پچھلے رکوع میں یوں کھینچا گیا ہے کہ : هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا

جب اہل ایمان اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم نکلے تو دشمنانِ دین کے جو لشکر بادلوں کی طرح اُمڈ کر آئے تھے وہ ایسے چھٹ گئے جیسے تھے ہی نہیں ۔ غزوۂ احد میں تو ستر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید ہوئے تھے لیکن یہاں کھلے مقابلے کی نوبت نہیں آئی ۔ البتہ ایک دو مرتبہ خندق میں کود جانے والے کفار سے کچھ مبارزتیں ہوئیں اور تیراندازی سے چند صحابہؓ شہید ہوئے جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں ۔ اس غزوے میں باقاعدہ کھلا مقابلہ تو ہوا ہی نہیں ۔ البتہ محاصرہ بڑا شدید اور خطرہ بڑا مہیب تھا کہ محاصرے کی طوالت' دشمنانِ اسلام کے لشکر کی تعداد' پھر سردی کا عالم اور سامانِ خورد و نوش کی قلّت کی وجہ سے خندق میں موجود صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا' جس کا نقشہ آیت نمبر ۱۰ میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے کہ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ" جب خوف کی وجہ سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے مُنہ کو آنے لگے ۔" تو اِن حالات میں مؤمنینِ صادقین کی دلی کیفیات اور ان کے صبر و ثبات کا نقشہ آیت ۲۲ میں بیان ہوا کہ :

"اور حقیقی اہل ایمان کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ

وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی. اور اس واقعہ نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیات میں مزید اضافہ کر دیا''.

اس امتحان و آزمائش کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین اور مؤمنین صادقین علیحدہ علیحدہ نمایاں ہو گئے. غزوۂ اُحد کے موقع پر جو منافقین راستے ہی سے پلٹ گئے تھے انہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو وہ ہر گز پیٹھ نہ پھیریں گے. غزوۂ خندق میں جب اُحد سے بھی بڑا خطرہ سامنے آیا تو ان منافقین کا پول کھل گیا اور واضح ہو گیا کہ یہ لوگ اپنے اس عہد میں کتنے مخلص اور سچے تھے۔

جب امتحان مکمل ہو گیا اور مؤمنینِ صادقین اور منافقین بھی چھٹ کر نمایاں ہو گئے تو نصرتِ الٰہی آ گئی اور ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسے نادیدہ لشکر اتارے جنہوں نے دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی. مزید برآں اپنی غیبی تائید سے کچھ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان حملہ آوروں کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلتے بنے. از روئے الفاظِ قرآنی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ (آیت ۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے. جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہیں آتی تھیں. اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔''

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. اسوۂ حسنہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟ وضاحت کریں۔
2. قرآن کریم میں اسوۂ حسنہ کو کس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے؟ کم از کم دو آیات کی روشنی میں وضاحت کریں۔
3. نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو قرآن مجید نے کس طرح بہترین نمونہ قرار دیا ہے؟ کسی ایک آیت کی تفسیر بیان کریں۔
4. اسوۂ حسنہ کی پیروی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔
5. آج کے دور میں اسوۂ حسنہ پر عمل کرنا کس طرح ممکن ہے؟ چند عملی مثالیں دیں۔

یونٹ نمبر: 06

قرآنی شخصیات

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 88
یونٹ کے مقاصد 88
قرآنی شخصیات 89
ملائکہ 89
وجہ تسمیہ 89
صورت و ہیئت 89
مشہور فرشتے 90
نوری مخلوق 90
ذمہ داریاں 90
کراماً کاتبین 91
انبیا اکرام اور قرآن مجید 92
قرآن مجید اور آدم علیہ السلام 92
اماں حوا علیہا السلام کی پیدائش 92
ذکر آدم (علیہ السلام) سے متعلق آیات قرآنی 92
پیدائش آدمؑ فرشتوں کو سجدہ کا حکم، شیطان کا انکار 9
سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ 94
ابلیس کی طلب مہلت 95
خلافت آدم 98
تعلیم آدمؑ اور فرشتوں کا اقرار عجز 99
تخلیقِ آدم (علیہ السلام) کا وقت 100
حضرت آدم (علیہ السلام) کی عصمت 10
پیغمبر الیسع کا قصہ 102

قرآن اور حضرت الیسع (علیہ السلام)..... 103
موعظت 103
ایوب علیہ السلام 103
حضرت ایوب (علیہ السلام) اور قرآن مجید..... 103
داؤد علیہ السلام 106
خود آزمائی 112

یونٹ کا تعارف

قرآن مجید نے کثیر تعداد میں شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ان میں ملائکہ ،انبیاء، بادشاہ اور دیگر اولیاء واشخاص شامل ہیں۔یونٹ ہذا میں ان اشخاص سے متعلق قرآنی معلومات کو موضوعاتی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔تاکہ ایک ایک شخص کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں۔البتہ موضوع کو طوالت سے بچانے کے لیے کچھ اشخاص کا تعارف پیش کرنے کے بعد مزید مطالعہ کے لیے کچھ کتب کی نشاندہی کر دی گئی ہے تاکہ خواہش مند قارئین ان کتب سے استفادہ کر سکیں۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ قرآن میں مذکور اشخاص کی مختلف انواع کو جان سکیں۔

2۔ قرآنی انبیاء اور نیک لوگوں کے احوال جان سکیں۔

3۔ قرآن میں مذکور بدکار اور ظالم لوگوں کے احوال جان سکیں۔

قرآنی شخصیات

ملائکہ

ایمان بالملائکہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔

لفظی معنی

ملائکہ، ملک ''م-ل-ک'' سے مشتق ہے، اس کی جمع ملائکہ اور ملائک ہے، اس کے لغوی اور لفظی معانی مالک ہونا، فرشتہ، ملکیت اور اقتدار ہیں، اس کے علاوہ اس میں تصرف، قدرت اور امر کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ لفظ ملائکہ آسمانی ارواح کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی امر یا کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے، اس وجہ سے ان کو ملائکہ کہتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے مقبول بندوں تک پہنچانے کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔ وہ لطیف اور نورانی مخلوق ہیں اور عام انسان انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ بعض کم فہم لوگ فرشتوں کے خارجی وجود کا انکار کرتے ہیں اور ان قرآنی آیات کی تلاوت جن میں فرشتوں کا ذکر ہے مجرد قوتوں کے طور پر کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایسے تصورات گمراہی پر مبنی ہیں۔ ملائکہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کرنے والی معزز مخلوق ہے۔ ان کے وجود اور ان سے متعلقہ تفصیلات کو ماننا ایمان بالملائکہ کہلاتا ہے۔

صورت و ہیئت

فرشتوں کی کوئی خاص صورت نہیں، صورت اور بدن ان کے حق میں ایسا ہے کہ جیسے انسانوں کے لیے ان کا لباس، اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ طاقت دی ہے کہ جو شکل چاہیں اختیار کر لیں۔ ہاں قرآن شریف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے بازو ہیں، اس پر ہمیں ایمان رکھنا چاہیے۔

تعداد

فرشتے بے شمار ہیں، ان کی تعداد وہی جانے جس نے انھیں پیدا کیا۔ ان کی پیدائش روزانہ جاری ہے، ہر روز بے شمار پیدا ہوتے ہیں۔ مشہور قول ہے کہ نیک کلام، اچھا کام فرشتہ بن کر آسمان کو بلند ہوتا ہے۔

مشہور فرشتے

یوں تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار فرشتے پیدا فرمائے ہیں، تاہم درج ذیل فرشتے زیادہ مشہور ہیں:

1. حضرت جبرائیل علیہ السلام: ان کے ذمہ پیغمبروں کی خدمت میں وحی لانا ہے۔
2. حضرت میکائیل علیہ السلام: ان کے ذمہ بارش برسانے اور خدا کی مخلوق کو روزی پہنچانا ہے۔
3. حضرت اسرافیل علیہ السلام: ان کے ذمہ قیامت کے دن صور پھونکنا ہے۔
4. حضرت عزرائیل علیہ السلام: ان کے ذمہ روح قبض کرنے یعنی لوگوں کی جان نکالنے کی خدمت سپرد کی گئی ہے۔

نوری مخلوق

فرشتے اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق ہیں۔ ملائکہ کی حقیقت بارے کئی اقوال ہیں، جن میں سے متفقہ اقوال یہ ہیں

فَذَهَبَ أَكْثَرُ الْمُسْلِمِيْنَ إِلٰى أَنَّهَا أَجْسَامٌ لَطِيْفَةٌ، قَادِرَةٌ عَلَى التَّشَكُّلِ بِأَشْكَالٍ مُخْتَلِفَةٍ

''پس جمہور مسلمانوں کے مطابق ملائکہ وہ لطیف نورانی اجسام ہیں جنہیں (اپنی لطافت و نورانیت کے باعث) مختلف شکلیں بدلنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔: ''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ، وَ خُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ، وَ خُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ۔

''فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا، جنات کو شعلہ زن آگ سے پیدا کیا گیا اور آدم کو اس شے سے پیدا کیا گیا ہے، جس کی صفت اللہ تعالیٰ نے تمھیں بیان فرمائی ہے (یعنی خاک سے)۔''

ذمہ داریاں

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی سرشت میں کامل اطاعت کا پہلو رکھا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کائنات کے مختلف امور سرانجام دیتے ہیں اور از خود کوئی قدرت نہیں رکھتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ طَرْفَ صَاحِبِ الصُّورِ مُذْ وُكِّلَ بِهِ مُسْتَعِدٌّ يَنْظُرُنَحْوَ الْعَرْشِ مَخَافَةَ أَنْ يُؤْمَرَ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْهِ طَرْفُه كَأَنَّ عَيْنَيْهِ

''بلاشبہ حضرت اسرافیل جب سے صور پھونکنے پر مقرر ہوئے ہیں تب سے تیار ہیں۔ عرش کے ارد گرد اس خوف سے نظر کر رہے ہیں کہ انھیں نظر جھپکنے سے قبل حکم نہ دے دیا جائے، اس کی دونوں آنکھیں چمکدار ستاروں کی مانند ہیں۔''

کراماً کاتبین

انسانوں کے اعمال لکھنے والے فرشتے کراماً کاتبین ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ. كِرَامًا كَاتِبِينَ .يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ

''حالانکہ تم پر نگہبان فرشتے مقرر ہیں، (جو) بہت معزز ہیں، (تمھارے اعمال نامے) لکھنے والے ہیں۔ وہ ان (تمام کاموں) کو جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''

حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

'کراماً کاتبین دو فرشتے ہیں ان میں سے ایک اس (انسان) کی دائیں طرف ہوتا ہے جو نیکیاں تحریر کرتا ہے اور ایک اس کے بائیں طرف ہوتا ہے جو برائیاں لکھتا ہے۔ دائیں طرف والا فرشتہ اپنے ساتھی (فرشتہ) کی گواہی کے بغیر نیکی لکھ دیتا ہے، مگر بائیں طرف والا اپنے ساتھی (فرشتہ) کی گواہی کے بغیر کوئی برائی نہیں لکھتا۔ اگر وہ آدمی بیٹھتا ہے تو ایک اس کے دائیں اور دوسرا اس کے بائیں ہوتا ہے، اور اگر وہ چلتا ہے تو ایک ان میں سے اس کے آگے ہوتا ہے اور دوسرا اس کے پیچھے، اور اگر وہ سوتا ہے تو ایک ان میں سے اس کے سر کے پاس ہوتا ہے اور دوسرا اس کے پاؤں کی جانب ہوتا ہے۔ ''

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ .مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ

''جب دو لینے والے (فرشتے اس کے ہر قول و فعل کو تحریر میں) لے لیتے ہیں (جو) دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ منہ سے کوئی بات نہیں کہنے پاتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لیے) تیار رہتا ہے۔''

انبیا اکرام اور قرآن مجید

قرآن مجید اور آدم علیہ السلام

قرآن مجید میں ہے کہ آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی (اور بے شک ہم نے انسان کو بجتی ہوئی خشک مٹی سے پیدا کیا جو پہلے سیاہ سڑا ہوا گارا تھی۔) سورت 15 آیات 26۔ چنانچہ روایت ہے کہ جب خداوند قدوس عزوجل نے آپ کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو عزرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ زمین سے ایک مٹھی مٹی لائیں۔ حکمِ خداوندی عزوجل کے مطابق عزرائیل علیہ السلام نے آسمان سے اتر کر زمین سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی تو پوری روئے زمین کی اوپری پرت چھلکے کے مانند اتر کر آپ کی مٹھی میں آگئی۔ جس میں ساٹھ رنگوں اور مختلف کیفیتوں والی مٹیاں تھیں یعنی سفید و سیاہ اور سرخ و زرد رنگوں والی اور نرم و سخت، شیریں و تلخ، نمکین و پھیکی وغیرہ کیفیتوں والی مٹیاں شامل تھی۔

فرشتوں کا سجدہ کرنا

تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ انھیں سجدہ کرو۔ ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور وہ جِنوں میں سے تھا۔ ابلیس نافرمانی کے سبب راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ آدم علیہ السلام جنت میں رہتے تھے۔

اماں حوا علیہا السلام کی پیدائش

کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی سے ایک عورت پیدا کی۔ حوا اس کا نام رکھا۔ ان دونوں کو حکم ہوا کہ جنت کی جو نعمت چاہو، استعمال کرو مگر اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ ظالموں میں شمار کیے جاؤ گے۔ لیکن شیطان کے بہکانے پر انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ اس پاداش میں آدمؑ اور حواؑ کو جنت سے زمین کی طرف بھیج دیا گیا۔

ذکر آدم (علیہ السلام) سے متعلق آیات قرآنی

قرآن مجید میں انبیا کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ ابوالبشر حضرت آدم (علیہ السلام) کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے : سورۃ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور

سورۃ حجر و سورۃ ص میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور آل عمران' مائدہ' مریم اور یٰس میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اوپر کی تمام سورتوں اور آیتوں میں اگرچہ اسلوب بیان' طرزِ ادا اور لطیف تعبیر کے اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے' لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت و عبرت کے پیش نظر حسب موقع بیان کی گئی ہے۔

پیدائش آدمؑ فرشتوں کو سجدہ کا حکم' شیطان کا انکار

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا' اور ان کا خمیر تیار ہونے سے قبل ہی اس نے فرشتوں کو یہ اطلاع دی کہ عنقریب وہ مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہے جو بشر کہلائے گی' اور زمین میں ہماری خلافت کا شرف حاصل کرے گی۔ آدم (علیہ السلام) کا خمیر مٹی سے گوندھا گیا اور ایسی مٹی سے گوندھا گیا جو نت نئی تبدیلی قبول کر لینے والی تھی' جب یہ مٹی پختہ ٹھیکری کی طرح آواز دینے اور کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس جسد خاکی میں روح پھونکی اور وہ یک بیک گوشت پوست' ہڈی' پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور ارادہ' شعور' حس' عقل اور وجدانی جذبات و کیفیات کا حامل نظر آنے لگا۔ تب فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم اس کے سامنے سر بہ سجود ہو جاؤ' فوراً تمام فرشتوں نے تعمیل ارشاد کی مگر ابلیس (شیطان) نے غرور و تمکنت کے ساتھ صاف انکار کر دیا۔ قرآن عزیز کی ان آیات میں واقعہ کے اسی حصہ کو بیان کیا گیا ہے : { وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ۔ وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَ کُلَا مِنْھَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ }

اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم کے آگے سر بہ سجود ہو جاؤ' وہ جھک گئے' مگر ابلیس کی گردن نہیں جھکی' اس نے نہ مانا' اور گھمنڈ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم سے کہا اے آدم تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو جس طرح چاہو' کھاؤ پیو' امن چین کی زندگی بسر کرو' مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے' تو کبھی اس کے پاس نہ پھٹکنا' اگر تم اس کے قریب گئے' تو (یہ نتیجہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے' اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔

{ وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط لَمْ یَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ } اور (دیکھو یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ) ہم نے تمھیں پیدا کیا (یعنی تمھارا وجود پیدا کیا) پھر تمھاری (یعنی نوع انسانی کی) شکل و صورت بنادی' پھر (وہ وقت آیا کہ) فرشتوں کو حکم دیا "آدم کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک

گئے' مگر ابلیس کہ جھکنے والوں میں نہ تھا۔

{ وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۔ وَ الۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ۔ وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۔ فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ ۔ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَةُ کُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ۔ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ۔ }

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا' جو سوکھ کے بجنے لگتا ہے اور ہم " جن " کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے' اور (اے پیغمبر !) جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا " میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے' ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں (یعنی نوع انسانی پیدا کرنے والا ہوں) تو جب ایسا ہو کہ میں اسے درست کر دوں (یعنی وہ وجود تکمیل کو پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو چاہیے کہ تم سب اس کے آگے سر بہ سجود ہو جاؤ " چنانچہ جتنے فرشتے تھے سب اس کے آگے سر بہ سجود ہو گئے' مگر ایک ابلیس' اس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہوں۔

{ وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ کَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوۡنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِیۡ وَ هُمۡ لَکُمۡ عَدُوٌّ ؕ بِئۡسَ لِلظّٰلِمِیۡنَ بَدَلًا }

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا " آدم کے آگے جھک جاؤ " اور سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا تھا' وہ جنوں میں سے تھا' پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر (کہ تمھارا پروردگار ہوں) اسے اور اس کی نسل کو کارساز بناتے ہو' حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں ؟ (دیکھو) ظلم کرنے والوں کے لیے کیا ہی بری تبدیلی ہوئی !

{ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ۔ فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ ۔ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَةُ کُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ۔ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اِسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۔ }

اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں' پس جب میں اس کو بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں' تو سب فرشتے اس کے لیے سر بہ سجود ہو جاؤ پس سبھی نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ مانا' گھمنڈ کیا اور وہ (علم الٰہی میں پہلے ہی) کافروں میں سے تھا۔

سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ

اللہ تعالیٰ اگرچہ عالم الغیب اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور ماضی' حال اور استقبال سب اس کے لیے یکساں ہیں مگر اس نے امتحان و آزمائش کے لیے ابلیس (شیطان) سے سوال کیا : {مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ } کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جب کہ میں نے حکم دیا تھا؟" ابلیس نے جواب دیا : {اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ط خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ } اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔" شیطان کا مقصد یہ تھا کہ میں آدم سے افضل ہوں' اس لیے کہ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے اور آدم مخلوق خاکی' بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت ؟ اے خدا ! پھر تیرا یہ حکم کہ ناری خاکی کو سجدہ کرے کیا انصاف پر مبنی ہے ؟ میں ہر حالت میں آدم سے بہتر ہوں' لہٰذا وہ مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں اس کے سامنے سر بہ سجود ہوں' مگر بد بخت شیطان اپنے غرور و تکبر میں یہ بھول گیا کہ جب تو اور آدم (علیہ السلام) دونوں خدا کی مخلوق ہو' تو مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی' وہ اپنی تمکنت اور گھمنڈ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مرتبہ کی بلندی و پستی اس مادہ کی بنا پر نہیں ہے جس سے کسی مخلوق کا خمیر تیار کیا گیا ہے بلکہ اس کی ان صفات پر ہے جو خالق کائنات نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔ بہر حال شیطان کا جواب چونکہ غرور و تکبر کی جہالت پر مبنی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر واضح کر دیا کہ جہالت سے پیدا شدہ کبر و نخوت نے تجھ کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترام خالقیت سے بھی منکر ہو گیا' اس لیے مجھ کو ظالم قرار دیا اور یہ نہ سمجھا کہ تیری جہالت نے تجھ کو حقیقت کے سمجھنے سے درماندہ و عاجز بنا دیا ہے پس تو اب اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ہلاکت کا مستحق ہے اور یہی تیرے عمل کی قدرتی پاداش ہے۔

ابلیس کی طلب مہلت

ابلیس نے جب دیکھا کہ خالق کائنات کے حکم کی خلاف ورزی' تکبر و رعونت اور خدائے تعالیٰ پر ظلم کے الزام نے ہمیشہ کے لیے مجھ کو رب العلمین کی آغوش رحمت سے مردود اور جنت سے محروم کر دیا' تو توبہ اور ندامت کی جگہ اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کی کہ تا قیام قیامت مجھ کو مہلت عطا کر اور اس طویل مدت کے لیے میری زندگی کی رسی کو دراز کر دے۔ حکمت الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا' لہٰذا اس کی درخواست منظور کر لی گئی' یہ سن کر اب اس نے پھر ایک مرتبہ اپنی شیطنت کا مظاہرہ کیا' کہنے لگا ! جب تو نے مجھ کو راندہ درگاہ کر ہی دیا تو جس آدم کی بدولت مجھے یہ

رسوائی نصیب ہوئی میں بھی آدم کی اولاد کی راہ ماروں گا اور ان کے پس و پیش' ارد گرد اور چہار جانب سے ہو کر ان کو گمراہ کروں گا' اور ان کی اکثریت کو تیرا ناسپاس اور ناشکر گزار بنا چھوڑوں گا' البتہ تیرے " مخلص بندے " میرے اغوا کے تیر سے گھائل نہ ہو سکیں گے اور ہر طرح سے محفوظ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ہم کو اس کی کیا پروا' ہماری فطرت کا قانون " مکافاتِ عمل و پاداشِ عمل " اٹل قانون ہے' پس جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا' جو بنی آدم مجھ سے رو گردانی کر کے تیری پیروی کرے گا وہ تیرے ساتھ ہی عذاب الٰہی (جہنم) کا سزاوار ہو گا' جا اپنی ذلت و رسوائی اور شومی قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہو اور اپنی اور اپنے پیروؤں کی ابدی لعنت (جہنم) کے منتظر رہو۔ قرآن مجید کی حسب ذیل آیات انھی تفصیلات پر روشنی ڈالتی ہیں : { مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ ط قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ج خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ۔ قَالَ فَاھْبِطْ مِنْھَا فَمَا یَکُوْنُ لَکَ اَنْ تَتَکَبَّرَ فِیْھَا فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ۔ قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۔ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ۔ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمْ مِّنْم بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِھِمْ ط وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شٰکِرِیْنَ۔ قَالَ اخْرُجْ مِنْھَا مَذْئُوْمًا مَّدْحُوْرًا ط لَمَنْ تَبِعَکَ مِنْھُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَھَنَّمَ مِنْکُمْ اَجْمَعِیْنَ۔ }

کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟ " کہا " اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ " فرمایا " جنت سے نکل جا۔ تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو۔ یقیناً تو ان میں سے ہوا جو ذلیل و خوار ہیں۔ " ابلیس نے کہا " مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) اٹھائے جائیں گے۔ تجھے مہلت ہے " اس پر ابلیس نے کہا " چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کر دی' تو اب میں بھی ایسا ضرور کروں گا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں' پھر سامنے سے' پیچھے سے' داہنے سے' بائیں سے (غرض کہ ہر طرف سے) ان پر آؤں اور تو ان میں سے اکثروں کو شکر گزار نہ پائے گا " خدا نے فرمایا : " یہاں سے نکل جا' ذلیل اور ٹھکرایا ہوا' بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو (وہ) تیرا ساتھی ہو گا۔ اور میں البتہ ایسا کروں گا کہ (پاداش عمل) میں تم سب سے جہنم بھر دوں !

{ قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا لَکَ اَلَّا تَکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ۔ قَالَ لَمْ اَکُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَہٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْھَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ ۔ وَّ اِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَۃَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۔ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۔ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۔ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ ۔ اِلَّا عِبَادَکَ

مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۔ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ }

اللہ نے فرمایا : ابلیس ! تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ "کہا" مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے "حکم ہوا" اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا' کہ تو راندہ ہوا اور جزا کے دن تک تجھ پر لعنت ہوئی "اس نے کہا" :

خدایا ! مجھے اس دن تک مہلت دے جب انسان (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔ "فرمایا : "اس مقررہ وقت کے دن تک تجھے مہلت دی گئی۔ "اس نے کہا : "خدایا ! چونکہ تو نے مجھ پر (نجات وسعادت کی) راہ بند کر دی' تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کے لیے جھوٹی خوشنمائیاں بنادوں اور (راہِ حق سے) گمراہ کر دوں' ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (میں جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں۔ "فرمایا : "بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے' جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف انہی پر چلے گا جو (بندگی کی) راہ سے بھٹک گئے اور ان سب کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے (جو کبھی ٹلنے والا نہیں) ۔

{ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۔ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ز لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۔ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ط وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ط وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۔ {

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا : "آدم کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے مگر ایک ابلیس نہ جھکا اس نے کہا : "کیا میں ایسی ہستی کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" نیز اس نے کہا "کیا تیرا یہی فیصلہ ہوا کہ تو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں ضرور اس کی نسل کی بیخ وبنیاد اکھاڑ کے رہوں' تھوڑے آدمی اس ہلاکت سے بچیں' اور کوئی نہ بچے۔ "اللہ نے فرمایا : "جا اپنی راہ لے' جو کوئی بھی ان میں سے تیرے پیچھے چلے گا' تو اس کے لیے اور تیرے لیے جہنم کی سزا ہو گی پوری پوری سزا' ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے' بہکانے کی کوشش کر لے' اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر' ان کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا' ان سے (طرح طرح کی باتوں کے)

وعدے کر اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سر تا سر دھوکا' جو میرے (سچے) بندے ہیں ان پر تو قابو پانے والا نہیں' تیرا پروردگار کارسازی کے لیے بس کرتا ہے۔

{ قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ۔ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ط خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۔ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ۔ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۔ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۔ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۔ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۔ قَالَ فَالْحَقُّ ۙ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۔ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۔ }

فرمایا اے ابلیس ! کس چیز نے روک دیا تجھ کو کہ سجدہ کرے اس کو جس کو میں نے بنایا اپنے (قدرت کے) ہاتھوں سے' یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجہ میں' بولا میں بہتر ہوں اس سے' مجھ کو بنایا آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے' فرمایا تو تو نکل یہاں سے کہ تو مردود ہوا اور تجھ پر میری پھٹکار ہے اس جزا کے دن تک' بولا' اے رب ! مجھ کو ڈھیل دے اس دن تک جس دن مردے جی اٹھیں۔ فرمایا تجھ کو ڈھیل ہے' اس وقت کے دن تک جو معلوم ہے' بولا تو قسم ہے تیری عزت کی میں گمراہ کروں گا ان سب کو' مگر جو بندے ہیں تیرے ان میں چنے ہوئے' فرمایا' تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں۔ مجھ کو بھرنا ہے دوزخ کو تجھ سے اور جو ان میں تیری راہ چلیں ان سب سے۔"

خلافت آدم

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں' جو اختیار و ارادہ کا مالک ہوگا' اور میری زمین پر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے گا کر سکے گا' اور اپنی ضروریات کے لیے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے گا' گویا وہ میری قدرت اور میرے تصرف و اختیار کا "مظہر" ہوگا۔ فرشتوں نے یہ سنا تو حیرت میں رہ گئے' اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا اگر اس ہستی کی پیدائش کی حکمت یہ ہے کہ وہ دن رات تیری تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے اور تیری تقدیس و بزرگی کے گن گائے' تو اس کے لیے ہم حاضر ہیں' جو ہر لمحہ تیری حمد و ثنا کرتے اور بے چون وچرا تیرا حکم بجالاتے ہیں' ہم کو تو اس "خاکی" سے فتنہ و فساد کی بو آتی ہے' ایسا نہ ہو کہ یہ تیری زمین میں خرابی اور خونریزی بپا کر دے؟ بارِ الٰہا ! تیرا یہ فیصلہ آخر کس حکمت پر مبنی ہے؟ بارگاہِ الٰہی سے اوّل ان کو یہ ادب سکھایا گیا کہ مخلوق کو خالق کے معاملات میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہیے' اور اس کی جانب سے حقیقت حال کے اظہار سے قبل ہی شک و شبہ کو سامنے نہ لانا چاہیے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں اپنی برتری اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہو' خالق کائنات ان حقائق کو جانتا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو' اور اس کے علم میں وہ سب

کچھ ہے جو تم نہیں جانتے۔ { وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ } اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں' فرشتوں نے کہا : کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی' حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیری مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے !) اللہ نے کہا' میری نظر جس حقیقت پر ہے' تمھیں اس کی خبر نہیں۔"

تعلیم آدمؑ اور فرشتوں کا اقرار عجز

حضرت آدم (علیہ السلام) کو اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت "علم" سے نوازا اور ان کو علم اشیاء عطا فرمایا۔ اور پھر فرشتوں کے سامنے پیش کر کے ارشاد فرمایا کہ تم ان اشیاء کے متعلق کیا علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم تھے کیا جواب دیتے۔ مگر چونکہ بارگاہ صمدیت سے قرب رکھتے تھے سمجھ گئے کہ ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل ہم کو ان کا علم ہی کب دیا گیا ہے کہ آزمائش کی جاتی بلکہ یہ تنبیہ مقصود ہے کہ "خلافتِ الٰہیہ" کا مدار کثرت تسبیح و تحلیل اور تقدیس و تمجید پر نہیں بلکہ صفت "علم" پر ہے' اس لیے کہ ارادہ و اختیار' قدرتِ تصرف اور قدرت اختیار یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حکومت ارضی صفت "علم" کے بغیر ناممکن ہے' پس جبکہ آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کا مظہر اتم بنایا ہے تو بلاشبہ وہی خلافت ارضی کا مستحق ہے نہ کہ ہم' اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ملائکہ اللہ چونکہ اپنی خدمات مفوضہ کے علاوہ ہر قسم کی دنیوی خواہشوں اور ضرورتوں سے بے نیاز ہیں' اس لیے وہ ان کے علم سے بھی ناآشنا تھے اور آدم (علیہ السلام) کو چونکہ ان سب سے واسطہ پڑنا تھا اس لیے ان کا علم اس کے لیے ایک فطری امر تھا۔ جو ربّ العٰلمین کی ربوبیت کاملہ کی بخشش و عطا سے عطا ہوا اور اس کو وہ سب کچھ بتا دیا گیا جو اس کے لیے ضروری تھا۔ { وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآئَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآئِ ھٰٓؤُلَآئِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۔ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ ج فَلَمَّآ اَنْبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ لا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لا وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ ۔ } (پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا تھا' ظہور میں آ گیا) اور آدم نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لیے' تو فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیے اور فرمایا' اگر تم (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتلاؤ' ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا' خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی

لیے ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلادیا' علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت ! جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو حکم الٰہی ہوا " اے آدم تم (اب) فرشتوں کو ان (حقائق) کے نام بتلا دو " جب آدم نے بتلا دیے تو اللہ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں " !

تخلیقِ آدم (علیہ السلام) کا وقت

یہ مسئلہ بھی لائق فکر و نظر ہے کہ انسان اوّل حضرت آدم (علیہ السلام) کی پیدائش کب ہوئی' کیا کائنات ارضی و سماوی کے ساتھ ساتھ یا غیر معین مدت کے بعد اس کی ہستی عالم وجود میں آئی؟ علمائے یہود و نصاریٰ اور بعض علمائے اسلام کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے تخلیق و تکوین کائنات کے بارہ میں جو " ستۃ ایام " (چھ دن) کی تعبیر اختیار فرمائی ہے انھی ایام میں سے ایک دن حضرت آدم (علیہ السلام) نے بھی لباس وجود پہنا اور وہ جمعہ کا دن ہے۔ { اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ } کچھ شک نہیں کہ تمھارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر چھا گیا۔ " لیکن یہ مسلک درست نہیں ہے نہ علمی و تاریخی اعتبار سے اور نہ دینی و مذہبی روایات کے لحاظ سے' یہود و نصاریٰ کے متعلق تو معلوم نہیں کہ انھوں نے کس بنیاد پر یہ کہا' اور اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے مگر علامہ سبکی سے ضرور یہ تعجب ہے کہ انھوں نے اس بے دلیل بات کو کس طرح قبول فرمایا اور یہ مسلک کیوں اختیار کیا۔ کافی غور و فکر کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سبکی کو یہ مغالطہ غالباً صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوا ہے جو فضائل جمعہ میں مذکور ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی ہے۔ اس روایت میں صرف اسی قدر مذکور ہے مگر سبکی نے اپنی جانب سے یہ اضافہ کر لیا کہ یہ جمعہ " ستۃ ایام " میں شامل جمعہ کا دن ہے اور یہی مغالطہ ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن عزیز نے متعدد جگہ خلق کائنات کا ذکر کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی خلق آدم (علیہ السلام) کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ارض و سماوات سے زیادہ حضرت آدم (علیہ السلام) کا ذکر ضروری تھا جو قرآن ہی کی زبان میں اشرف المخلوقات' اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر اہم شخصیت کو " ستۃ ایام " ہی میں سے کسی دن (یوم) وجود بخشا جائے اور اس کا ذکر تک نہ کیا جائے کیونکہ ان آیات میں صرف دو ہی باتیں ذکر کی گئی ہیں ایک ارض و سماوات کی پیدائش کا معاملہ اور دوسرا " استواء علی العرش " کا' مگر حضرت آدم کی ولادت سے متعلق صراحت تو کجا اشارہ تک موجود نہیں ہے پھر مستزاد یہ کہ قرآن عزیز

نے جس جس موقع پر حضرت آدم (علیہ السلام) کا ذکر کسی بھی نہج سے کیا ہے ان میں سے کسی ایک مقام پر بھی یوم پیدائش کا ذکر نہیں ہے تب بات واضح ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے کہ خلق سماوات وارض سے ہزاروں' لاکھوں بلکہ غیر معین مدت کے بعد (جس کا علم صرف عالم الغیب والشہادۃ ہی کو ہے) حضرت آدم (علیہ السلام) کو کسی جمعہ میں خلعت وجود عطا کیا گیا اور "ستۃ ایام" کے جمعہ کے دن کسی کی بھی تخلیق و تکوین نہیں ہوئی بلکہ استواء علی العرش کا مظاہرہ ہوا اور اس لیے جمعہ کا دن جشن یا تعطیل کا دن قرار پایا۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کی عصمت

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب حضرت آدم (علیہ السلام) کے واقعہ پر غور کیجئے اور نظر ڈالئے کہ قرآن عزیز "سورۃ بقرہ" میں جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو صاف طور پر یہ واضح کر دیا گیا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی : {فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ} شیطان نے ان دونوں سے لغزش کرادی" اور اس کے بعد سورۃ "اعراف" اور "طٰہٰ" میں دو جگہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے "وسوسہ" سے تعبیر کیا : {فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ} " [42] شیطان نے ان کو پھسلا دیا" اور "طٰہٰ" میں تیسری جگہ اس لغزش اور وسوسہ کا خود ہی سبب بیان کر کے حضرت آدم (علیہ السلام) کو ہر قسم کے ارادی اور عملی گناہ سے پاک ظاہر کیا اور ان کی عصمت کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنا دیا۔ {وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا} "اور بلاشبہ ہم نے آدم سے ایک اقرار لیا تھا پس وہ اس کو بھول گیا اور ہم نے اس کو پختہ ارادہ کا نہیں پایا (ہم نے اس کو اقرار کے پورا نہ کرنے میں اس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں پایا)" یہ آیات صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں بھی ان کے قصد وارادہ سے خلاف ورزی کا مطلق کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہو گیا اور وہ بھی نسیان اور بھول چوک کے ساتھ۔ ان تمام تصریحات کے بعد اب سورۃ طٰہٰ کی مسطورہ ذیل آیت کا مقصد خود بخود صاف ہو جاتا ہے : {وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى} اور آدم نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بہک گیا" ہم نے اس جگہ عصیان اور غوایت کے وہ معنی نہیں لیے جو عام بول چال میں بولے جاتے ہیں یعنی "گناہ" اور "گمراہی" اور ایسا تاویل بعید یا دور از کار توجیہ کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ لغت اور علم معانی کے عام اصول کے زیر نظر ہی کیا گیا ہے اس لیے کہ لغت عربی کی مشہور کتاب "لسان العرب" اور "اقرب الموارد" وغیرہ میں ہے "المعصیۃ مصدر و قد تطلق علی الزلّۃ مجازاً" (معصیت مصدر ہے اور کبھی مجاز کے طور پر لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اسی طرح "غویٰ" کے

معنی یہاں ضل یا خاب کے ہیں' پس اگر یہاں ضل مراد ہے تو اس کا اردو ترجمہ " بہک گیا" کیا جائے گا اور خاب مراد ہے تو" نقصان میں پڑ گیا" فصیح ترجمہ ہے۔ بہر حال واقعہ سے متعلق ان تمام آیات کو جو حضرت آدم (علیہ السلام) کی جلالت قدر' صفوت و برگزیدگی' اور خلعت خلافت سے سرفرازی کو ظاہر کرتی ہیں' جدا جدا کر کے نہ دیکھا جائے " جیسا کہ معترضین کا عام قاعدہ ہے اور جو اکثر قرآن فہمی میں گمراہی کا سبب بنتا ہے "اور سب کو یکجا جمع کر کے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی عصمت کا مسئلہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس میں قطعی کسی شائبہ ریب و شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اور بالفرض اگر عطی اور غوی کو عام معنی میں لیا جائے تب بھی وہ اصول پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو مسئلہ " عصمت " کی حقیقت کے سلسلہ میں ابھی بیان ہو چکا ہے کہ جب نصوص قرآن حضرت آدم (علیہ السلام) کی نبوت' صفوت 'اور خلافت جیسے عظیم الشان مراتب کا اظہار کرتی ہیں تو اس آیت میں ان کی اس لغزش کو ان سخت الفاظ کے ساتھ اس لیے یاد کیا گیا کہ آدم (علیہ السلام) جیسے مقرب بارگاہ الٰہی کے لیے جس کو خود اللہ تعالیٰ کی براہ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہے' یہ لغزش اور نسیان بھی اس کے مرتبہ سے نازل اور غیر موزوں ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ قابل گرفت ہے اگرچہ ابرار و نیکوکار انسانوں کے حق میں اس قسم کی غلطی ایک معمولی بات ہی کیوں نہ ہو۔

پیغمبر الیسع کا قصہ

پیغمبر **الیسع** کا قصہ سورۃانعام اور سورۃ ص میں آیا ہے۔آپ الیاس علیہ السلام کے چچازاد بھائی اور ان کے نائب و جانشین تھے۔ الیاس کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی اسرائیل کے لیے نبوت عطا کی۔ سورۃ انعام پارہ سات رکوع دس میں ہے۔ (ہم نے اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے پیدا کیا اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط کو اور سب کو فضیلت دی، دنیا والوں پر) قرآن مجید میں ہے۔ وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کر اور یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ لکھتے ہیں : ایک قوم نے یہ وہم کیا ہے کہ الیسع ہی الیاس ہیں' حالانکہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ وھب بن منبہ نے کہا کہ الیسع الیاس کے شاگرد ہیں اور یہ دونوں زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے گذرے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ الیاس (علیہ السلام) ہی ادریس ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے'۔ کیونکہ ادریس) علیہ السلام (نوح (علیہ السلام) کے دادا ہیں اور الیاس (علیہ السلام) ان کی اولاد میں سے ہیں۔

قرآن اور حضرت الیسع (علیہ السلام)

قرآن عزیز نے ان کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور سورۃ انعام اور سورۃ ص میں صرف ذکر پر اکتفا کیا ہے { : وَاِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَیُوْنُسَ وَلُوْطًا وَکُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ }

اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط اور ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

{ وَاذْکُرْ اِسْمٰعِیلَ وَالْیَسَعَ وَذَا الْکِفْلِ وَکُلٌّ مِّنَ الْاَخْیَارِ }

اور ذکر کر واسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا اور ان میں سے ہر ایک نیک انسانوں میں سے تھے۔

موعظت

بنی اسرائیل کے ان نبیوں اور پیغمبروں کے واقعات سے جو جلیل القدر انبیا (علیہ السلام) کے شرف صحبت اور مخلصانہ اتباع میں خلافت کے بعد منصب نبوت سے سرفراز ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحبت نیکاں حصول خیر کے لیے اکسیر اعظم ہے۔

مولانا رومی نے سچ کہا ہے:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سال طاعت بے ریا اگر ریاضت وطاعات کا سلسلہ ہزاروں سال بھی رہے مگر کسی کامل کی صحبت سے محرومی ہو تو بلاشبہ یہ ایک بہت بڑی خامی ہے جس کا مداوا صحبت کامل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ایوب علیہ السلام

پیغمبر۔ قرآن میں متعدد جگہ آپ کا ذکر ہے۔ سورۃ النساء آیہ 163 اور سورۃ انعام آیہ 85 میں دوسرے انبیا کرام کے ناموں کے ساتھ صرف آپ کا نام ہے، حالات نہیں۔ سورۃ انبیا (آیہ 83 تا 84) اور سورۃ ص (آیہ 41 تا 44) میں آپ کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔ قرآن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت خوش حال اور مالدار تھے۔ مفسرین نے آپ کے تفصیلی حالات لکھے ہیں جو تھوڑے سے اضافے کے ساتھ تمام تر بائبل سے ماخوذ ہیں۔ بائبل میں پورا ایک صحیفہ (سفر ایوب) کے نام سے ہے۔

حضرت ایوب (علیہ السلام) اور قرآن مجید

قرآن عزیز میں حضرت ایوب (علیہ السلام) کا ذکر چار سورتوں میں آیا ہے : سورۃ نساء ' سورہ

انعام ' سورہ انبیاء اور سورہ ص۔ سورہ نساء اور سورہ انعام میں تو انبیا (علیہم السلام) کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے:

{وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ}

اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان۔

{وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ}

اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون۔

اور سورۃ انبیاء اور سورہ ص میں مجمل تذکرہ ہے اور صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان پر آزمائش و امتحان کا ایک سخت وقت آیا اور مصیبتوں اور بلاؤں نے چہار جانب سے ان کو گھیر لیا' مگر وہ صبر و شکر کے ماسوا حرف شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور آخر کار ان کو خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا اور مصائب کے بادل دور کر کے ان کو فضل و عطا سے مالا مال کر دیا۔

حضرت ایوب (علیہ السلام) سے متعلق مسطورہ بالا حقائق روشن ہو جانے کے بعد اب اس مختصر اور مجمل واقعہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو سورۃ انبیا اور سورۃ ص میں مذکور ہے:

{وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ}

اور ایوب (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا "میں دکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدایا ! تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں" پس ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اس کا دکھ دور کر دیا اور اس کو اس کا کنبہ اور اس کی مثل اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اپنے عبادت گزار بندوں کی نصیحت کیلئے عطا کر دیا۔

{وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۔ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ط هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ ۘ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۔ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ط اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ط نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۔ }

اور یاد کر ہمارے بندے ایوب (کے معاملہ) کو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ مجھ کو شیطان نے ایذاء اور تکلیف کے ساتھ ہاتھ لگایا ہے (تب ہم نے اس سے کہا) اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار (اس نے ایسا ہی کیا اور چشمہ زمین سے ابل پڑا تو ہم نے کہا) یہ ہے نہانے کی جگہ ٹھنڈی اور پینے کی اور ہم نے اس کو اس کے اہل (و عیال)

عطا کئے اور ان کی مانند اور زیادہ اپنی مہربانی سے اور یادگار بننے کیلئے عقلمندوں کیلئے' اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھالے اور اس سے مار اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو' بیشک ہم نے اس کو صبر کرنے والا پایا (اور وہ اچھا بندہ ہے) بے شبہ وہ (خدا کی جانب) بہت رجوع ہونے والا تھا۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اَيُّوْبَ

وہ دولت و ثروت اور کثرت اہل و عیال کے لحاظ سے بھی بہت خوش بخت اور فیروز مند تھا' مگر یکایک امتحان و آزمائش میں آگیا اور متاع و مال' اہل و عیال اور جسم و جان سب کو مصیبت نے آگھیرا۔ مال و منال برباد ہوا' اہل و عیال ہلاک ہوئے اور جسم و جان کو سخت روگ لگ گیا' تب بھی اس نے نہ شکوہ کیا اور نہ شکایت بلکہ صبر و شکر کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی جناب میں صرف عرض حال کر دیا:

{ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ } پاس ادب کا یہ عالم ہے کہ یہ نہیں کہا : "تو نے مصیبت میں ڈال دیا" کیونکہ اس کو علم ہے کہ تکلیف و عذاب گو خدا ہی کی مخلوق ہیں مگر شیطانی اسباب پر ظہور پزیر ہوتے ہیں اس لیے یہ کہا" شیطان نے مجھ کو تکلیف و عذاب کے ساتھ چھو دیا" اور پھر عرض حال کے لیے نہایت عجیب و لطیف اور بلیغ پیرایہ بیان اختیار کیا کہ { اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ } "خدایا مجھ کو مصیبت نے آگھیرا ہے۔

" { وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ } "اور تو مہربانوں میں سب سے بڑا مہربان ہے" اور جب اس نے پکارا تو خدا نے سنا اور قبول کیا۔ جو مال و متاع برباد ہوا اور جو اہل و عیال ہلاک ہوئے خدا نے اس سے چند در چند اور زیادہ اس کو بخش دیے اور صحت و تندرستی کے لیے چشمہ جاری کر دیا کہ غسل کر کے چنگا ہو جائے:

{ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۔ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ } ۔

{ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ ۫ وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً }

اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ "رحمت" اس کا ذاتی وصف ہے:

{ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ }

اور تاکہ اہل بصیرت اور فرمان بردار بندے اس سے نصیحت و عبرت حاصل کریں۔

{ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ } { رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ }

اور پھر حضرت ایوب (علیہ السلام) کے صبر و عبودیت کی تعریف کرتے ہوئے اس نے یہ کہہ کر ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیے:

{ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ }

"اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے ایوب کو بڑا ہی صابر پایا' وہ بہت ہی اچھا بندہ اور ہماری جانب ہر حال میں رجوع ہونے والا تھا۔"

ان چار پانچ آیات میں حضرت ایوب (علیہ السلام) کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے' اس کے اعجاز کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھی واقعات کو بیان کرنے میں توریت کے سفر ایوب والے صحیفہ کے طویل بیالیس ابواب اور کئی سو آیات نے جگہ لی ہے۔

داؤد علیہ السلام

قرآن مجید کی سورۃ بقرہ، نساء، مائدہ، انعام، اسرا، انبیا اور سبا میں آپ کا ذکر ہے۔

بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے تورات نازل کی جا چکی تھی لیکن قوم شریعتِ موسوی کو فراموش کر کے راہ ہدایت سے بھٹک چکی تھی اللہ نے راہِ ہدایت کے لیے زبور نازل فرمائی۔ زبور کے لغوی معنوں میں سے ایک پارے اور ٹکڑے کے ہیں۔ بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو منتخب فرمایا اور انھیں زبور کا تحفہ عطا کیا۔ زبور، حمد و ثنائے کبریا سے معمور تھی۔ داؤد علیہ السلام کو ایک معجزہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ آپ مکمل زبور کی تلاوت اتنی مختصر مدت میں کر لیتے تھے کہ جتنی دیر میں گھوڑے پر زین کسی جاتی ہے۔ یوں آپ کا یہ معجزہ حرکتِ زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ داؤد علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا کیا تھا کہ جب آپ تلاوت فرماتے تو اس لحن کے باعث پرندے و جانور تک وجد میں آ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ترتیل کا حکم عطا کیا تھا، جس کے باعث پہاڑ اور پرندے ان کی خوش الحان قرات میں آواز سے آواز ملا کر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے۔ آپ کی آواز میں وہ نغمگی، مٹھاس اور ایسا زیر و بم تھا کہ شجر و حجر سبھی کو متاثر کرتا تھا۔ ہوا میں اُڑتے ہوئے پرندے رُک جاتے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہاڑ بھی صبح و شام ان کے ساتھ تسبیح کرنے پر مامور تھے۔ کائنات کا ہر ذرہ حمد و ثنا کرتا ہے بے شک ہم نہ سمجھ سکیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ ایک رات صحابیِ رسول ابو موسیٰ اشعری تلاوت کلام پاک کر رہے تھے۔ رسول کریم ﷺ دیر تک سنتے رہے پھر خوش ہو کر فرمایا کہ آج مجھے لحن داؤد علیہ السلام کا کچھ حصہ مل گیا ہے۔ داؤد علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک خاندان اور نبوت و رسالت کسی دوسرے خاندان سے وابستہ ہوتی تھی۔ داؤد علیہ السلام کے عہد میں یہود اکا گھرانا نبوت اور افراہم کا خاندان حکومت و سلطنت سے سرفراز تھا۔ شمویل کے عہد میں لوٹ مار اور حملہ آوروں کا زور بڑھتا ہی جا رہا

تھا۔ بنی اسرائیل نے آپ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ اپنے بیٹوں کی بجائے کہ وہ شرائط بادشاہت پر پورے نہیں اترتے، کسی اور کو بادشاہ مقرر کر دیجیے، جو ظالموں کا مقابلہ کرنے کی طاقت و قوت رکھتا ہو۔ بنی اسرائیل کے اصرار پر آپ نے طالوت نامی شخص کو بادشاہ مقرر کیا جو بہت بہادر و جری تھا جس نے نہایت سمجھداری سے مجاہدین کا انتخاب کیا جو دشمن سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔ ابھی مجاہدین میدانِ جنگ تک نہ پہنچے تھے کہ راستے میں ایک نہر آ گئی۔ گرمی کا موسم تھا، سبھی پیاسے ہو رہے تھے، طالوت نے اپنے مجاہدین کی صبر و برداشت اور ہمت و حوصلہ آزمانے کی خاطر حکم دیا کہ کوئی بھی ایک چلو سے زیادہ پانی نہ پیے۔ چند ایک کے سوا سبھی نے حکم عدولی کی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

''پھر جب طالوت فوجیں لے کر باہر نکلا تو اس نے کہا یقیناً اللہ تم کو ایک نہر سے آزمائے گا جس نے اس کا پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جس نے اس کے پانی کو نہ چکھا وہ میرا ہے مگر ہاں جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ پھر ان میں سے سوائے چند کے سب نے اس سے پانی پی لیا۔''

لشکر میدانِ جنگ پہنچا، وہ جنھوں نے جی بھر کر پانی پیا تھا، خود میں مقابلے کی طاقت نہ پا کر الگ ہو گئے کہ یہاں ان کا مقابلہ جالوت نامی بہت قوی و دیو ہیکل شخص سے تھا۔ لشکر بھی اس کا بہت بڑا تھا۔ طالوت کے مٹھی بھر مجاہدین کو جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی، جالوت اور اس کے لشکر سے خوفزدہ ہونا چاہیے تھا لیکن انھوں نے کہا کہ حق باطل پر غالب آتا رہا ہے۔ قلیل مجاہدین نے کفار کی کثیر تعداد پر فتح پائی ہے۔

فلسطین کا حکمران جالوت اپنی طاقت اور کثیر لشکر کے زعم میں بنی اسرائیل کو ہر صورت میں غلام بنانے پر تیار تھا۔ طالوت مقابلے کی سکت نہ رکھتا تھا اور پریشان تھا۔ مجلسِ مشاورت بلوائی گئی اور وہاں یہ تجویز منظور کی گئی کہ بنی اسرائیل کا جو جوان جالوت سے مقابلہ کر کے اسے ہلاک کرے گا، اسے نہ صرف نصف سلطنت کا مالک بنا دیا جائے گا بلکہ سردار طالوت اپنی خوبصورت بیٹی عنیاہ کی شادی بھی اس سے کر دیں گے، یہی زمانہ تھا کہ جب بنی شموئیل کو بشارت ہوئی تھی کہ لیئی (طبقاتِ ناصری میں یہ نام انسا اور قصص الانبیا میں ایشا درج ہے) کا چھوٹا بیٹا، طالوت کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کا حکمران ہو گا اور اس سے بڑھ کر ایک اور اعزاز اس کا منتظر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے نبوت کے لیے بھی اسی کو منتخب فرمایا ہے۔

داؤد علیہ السلام مستقبل کے اس خوب صورت لیکن ذمہ دار دور سے بے خبر جنگلوں میں بھیڑ بکریاں چراتے رہے اور ساتھ ساتھ اپنے دل پسند مشغلے میں بھی محو رہے۔ داؤد علیہ السلام فلاخن چلانے میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے پاس ہمہ وقت ایک لاٹھی، فلاخن اور ایک تھیلی میں چھوٹے چھوٹے پتھر ہوا کرتے تھے۔ ان کے فن نشانہ بازی میں مہارت

کا علم بنی اسرائیل کو بھی تھا، وہ کہا کرتے تھے داؤد علیہ السلام کے فلاخن کا نشانہ بننے والی چیز ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ ان کی بہادری کے قصے بھی مشہور تھے یہ بات بھی عام تھی کہ وہ جنگل میں شیر پر سواری کیا کرتے تھے۔

بادشاہ طالوت کی جانب سے کی جانے والی پیش کش کی آواز ان کے کان میں بھی پڑی، منادی کرنے والا ایک ہی اعلان بار بار دہرائے جا رہا تھا۔ اعلان سنتے ہی انھیں پتھروں کی گفتگو یاد آئی اور وہ فوراً ہی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔

بنی اسرائیل اور جالوت کی فوج ایک وادی میں جمع ہو رہی تھی جالوت کا عظیم لشکر اور جنگی ساز و سامان اور گھوڑوں کی تعداد، طالوت کے لشکر کی ہمت پست کرنے کے لیے کافی تھے لیکن طالوت اپنے مجاہدین کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ جالوت، طالوت کے مقابلے میں کم عمر بھی تھا، قدآور بھی اور زبردست ڈیل ڈول کا مالک بھی۔ اس کا سارا جسم پیتل کی زرہ نے محفوظ کر رکھا تھا، سر پر بھی پیتل ہی کا مضبوط خود پہن رکھا تھا، اس کے پورے جسم میں صرف آنکھیں ہی کھلی تھیں باقی تمام جسم دھاتوں کے نہ ٹوٹنے والے حصار میں مقید تھا۔ میدانِ جنگ پہنچ کر جالوت نے للکارا۔

''کوئی ہے جو میرا مقابلہ کرنے کی جرات کرے اور مجھے ہلاک کر کے اپنے بادشاہ کی طرف سے اعلان کیے گئے انعام کا حقدار ٹھہرے۔''

جالوت کا حلیہ اور پھر دبنگ آواز، کسی میں اس للکار کا جواب دینے کی جرات نہ ہوئی۔ جالوت نے چند مرتبہ، اپنی بات دہرائی اور جواب نہ پا کر اکڑتا ہوا واپس ہوا، یہی وہ لمحہ ہے کہ طالوت کے لشکر میں ہلچل پیدا ہوئی، لشکر کی پچھلی صفوں سے ایک نوجوان، جس کا جسم زرہ سے آزاد اور سر خول سے بے نیاز تھا، سامنے آیا اور جالوت کو للکارا، جالوت اس نوجوان کو دیکھ کر ہنسا، کیا میں کوئی کتا ہوں جو تو ایک لاٹھی لیے میرے مقابل آیا ہے، داؤد علیہ السلام کا جواب یہی تھا کہ ہاں میرے نزدیک تیری حیثیت ایک کتے سے زیادہ نہیں ہے۔ تیرے لیے میری یہ لاٹھی کافی ہے۔ جالوت کا غصے سے پاگل ہو جانا، ان ہونی بات نہ تھی، اس نے بہت برا بھلا کہنا شروع کیا، داؤد علیہ السلام اطمینان سے سنتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ حق کی باطل پر فتح ان ہی کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے، خود پر اعتماد اور اللہ پر یقین نے انھیں جرات عطا کی، وہ مسکراتے ہوئے جالوت کی جانب بڑھتے گئے، خاموشی سے تھیلے سے پتھر نکالا، فلاخن میں رکھا اور مہارت کے ساتھ اس کے ماتھے کا نشانہ لے ڈالا۔

خدا کی قدرت سے ہوا کا ایک جھونکا ایسا آیا کہ جالوت کا وزنی خود جس کا وزن اسی سیر اور طبقات ناصری کے موءلف و مترجم غلام رسول مہر کے مطابق ساٹھ سیر تھا، ایسے اڑ گیا جیسے ایک سوکھا پتا اڑتا ہے۔ داؤد علیہ السلام کا فلاخن سے پھینکا گیا پتھر فضا میں ہی تین حصوں میں منقسم ہو گیا دو ٹکڑے دائیں بائیں جانب سے نکلے اور تیسرا، عین

پیشانی کے درمیان میں لگا اور پیشانی چیر کر دوسری جانب سے نکل گیا۔ جالوت کے گھوڑے سے گرتے ہی داؤد علیہ السلام نے اس کا سر تن سے جدا کیا اور طالوت کے پاس لے گئے۔ یعنی جالوت کے دعووں کا پول کھلنے میں لمحہ بھر نہ لگا، فلسطینی فوج اچانک بازی پلٹتے دیکھ کر سراسیمگی کا شکار ہوئی۔ خود بنی اسرائیل بھی نہ جان پائے کہ اس ایک لمحے میں کیا ہو گیا ہے، لیکن جلد ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گئے اور ایک نئی قوت کے ساتھ دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور فلسطینیوں کو اپنے علاقے سے نکال باہر کیا۔ طالوت نے اپنا وعدہ نبھایا، آدھی سلطنت عطا کی اور بیٹی کی شادی آپ علیہ السلام سے کر دی۔ تمام بنی اسرائیل داؤد علیہ السلام کی بہادری اور عدل و انصاف کی وجہ سے بہت عزت کرتے تھے۔ حکومت کے نظم و نسق میں بہتری کے لیے انھوں نے کچھ ایسے اصول و ضوابط تشکیل دیے جو مملکت کی مضبوطی اور عوام کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتے تھے، عوام جان گئے کہ اب انھیں جو حکمران میسر آیا ہے وہ ان کا بہی خواہ ہے۔ آپ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے آپ کا سلسلۂ نسب گیارہ پشتوں سے ابراہیم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ سورہ البقرہ، النسائ، المائدہ، الانعام، الاسرائ، الانبیاء، النمل، السبا اور ص میں آپ کے حالات و واقعات اور رشد و ہدایت کا بیان ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے۔

ترجمہ: اور ہم نے اس (داؤد علیہ السلام) کو مضبوط ملک عطا کیا اور حکمت سے نوازا۔ اور حق و باطل کے فیصلے کی قوت عطا کی۔

ترجمہ: اللہ نے ان کو حکومت بھی عطا کی اور حکمت (نبوت) بھی اپنی مرضی سے جو چاہا سکھایا۔

عام نبیوں اور رسولوں میں آدم علیہ السلام کے علاوہ صرف داؤد علیہ السلام ہی وہ پیغمبر ہیں کہ جنھیں قرآن کریم میں ''خلیفہ'' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

آدم علیہ السلام سے داؤد علیہ السلام کی ایک نسبت اور بھی ہے۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ عالم بالا میں جب آدم علیہ السلام کی صلب سے ان کی ذریت کو نکال کر پیش کیا گیا تو انھوں نے ایک خوبصورت چمکتی ہوئی پیشانی والے شخص کو دیکھ کر دریافت کیا۔ پروردگار یہ کون شخص ہے؟ جواب ملا۔ تمہاری ذریت میں سے بہت بعد میں آنے والی ہستی داؤد علیہ السلام ہے آدم نے عرض کیا اس کی عمر کیا مقرر کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ساٹھ سال۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ الٰہی میں اپنی عمر کے چالیس سال اس نوجوان کو بخشتا ہوں۔ مگر جب آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت آ پہنچا تو آدم علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں۔ فرشتۂ موت نے کہا۔ آپ بھول گئے۔ آپ نے اس قدر حصۂ عمر اپنے ایک بیٹے داؤد علیہ السلام کو بخش دیا ہے۔

ایک صفت اور بھی ایسی تھی جس کی تعریف آنحضور ﷺ نے خود کی۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ نماز داؤد علیہ السلام کی ہے اور سب سے پسندیدہ روزے داؤد علیہ السلام کے ہیں۔ وہ آدھی رات سوتے، ایک تہائی رات عبادت کرتے اور پھر رات کے چھٹے حصے میں سو جاتے تھے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار فرماتے تھے اور جب دشمن سے مقابلہ ہو جاتا تو فرار اختیار نہ فرماتے تھے۔ بلاشبہ وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے۔

عبادت و ریاضت سے لگاؤ اس قدر تھا کہ ان کی شعوری کوشش تھی کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں وہ خود یا ان کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد عبادت میں مشغول رہے۔ یعنی کوئی لمحہ ایسا نہ گذرے جس میں وہ یا ان کے گھرانے کا کوئی فرد مصروف عبادت نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی نظام الاوقات مرتب کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے دل میں احساسِ فخر جاگا اور اپنی اور اپنے گھرانے کی عبادت گزاری پر خوش ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ توفیقِ عبادت بھی میری ہی عطا کی ہوئی ہے۔ میری مدد شامل نہ ہو تو یہ تیرے بس میں نہیں۔

قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے کہ

ایک دفعہ جب آپ اپنے نظام الاوقات کے مطابق عبادت میں مصروف تھے۔ آپ کی عبادت گاہ میں ناگاہ دو اشخاص دیوار پھاند کر آ گئے۔ آپ گھبرا گئے لیکن انھوں نے کہا کہ ہم اپنے ایک مقدمے کے فیصلے کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے اس بھائی کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں جبکہ میرے پاس صرف ایک ہے۔ یہ زبردستی مجھ سے میری دنبی لینا چاہتا ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تری دنبی اپنی دنبیوں میں ملانے کے لیے تجھ سے مانگتا ہے۔ بے شک ظلم کرتا ہے۔ یہ وقت آپ کی عبادت کا تھا نہ کہ عدالت لگانے کا۔ آپ نے صرف مدعی کا بیان سنا اور فیصلہ سنا دیا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ مقدمہ معمولی نوعیت کا تھا۔ سبھی جانتے ہیں کہ اس کا کیا فیصلہ ہو گا۔ پھر اتنا اہم بھی نہ تھا کہ فریق دیوار پھاند کر عبادت گاہ میں آ گئے۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام جان گئے کہ یہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے فرشتے تھے جو آپ کا امتحان لینے آئے تھے۔

ترجمہ: پس انھوں نے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کی اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے۔

یہاں کا استغفار جو مذکور ہے اس کا پسِ منظر اسرائیلیات کی وضاحتوں میں یہ آیا ہے کہ یہ تمام واقعہ علامتی پس منظر رکھتا ہے،، داؤد علیہ السلام کے دل میں کسی خواہش نے سر اٹھایا جو ایک نبی کے شایانِ شان نہ تھی، اُدھر جب ان کا دھیان گیا تو آپ نے توبہ و استغفار کی۔

نبی گناہوں سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں پھر بھی استغفار طلب کرتے رہتے ہیں۔ داؤد علیہ السلام بھی

خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا شکر اور اس کی عطا کردہ ذمہ داریوں سے احسن طریقوں سے سبکدوش ہونے کو اپنی صلاحیت وطاقت نہیں بتاتے بلکہ اسے بھی خدا کا انعام اور اس کی مدد تصور کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ استغفار پسندیدہ عمل ہے اس لیے سر بسجود ہو کر مغفرت طلب کرتے ہیں اور حق و باطل کے درمیان میں فیصلے کی قوت کو بھی اس کی عطا جانتے ہیں۔ قرآن مجید میں مذکور ہے:

اے داؤد علیہ السلام ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو نائب زمین میں پس فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان میں انصاف کے ساتھ اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی وہ بہکادے گی تمھیں راہِ خدا سے۔ بے شک جو لوگ بھٹک جاتے ہیں راہِ خدا سے ان کے لیے سخت عذاب ہے...

یہاں داؤد علیہ السلام کو بتایا جارہا ہے کہ تم کسی شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے کہ یہ سلطنت تمھیں ورثے میں مل گئی ہے۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے، اس کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم رعایا کے فیصلے عدل و انصاف کے مطابق کرو۔

ایک مرتبہ دو اشخاص ایک بیل پر حقِ ملکیت کا مقدمہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فیصلے کے لیے دوسرے دن انھیں طلب کیا۔ رات کو خواب میں حکم ہوا کہ دعویٰ دار کو قتل کر دیا جائے۔ صبح جب دونوں حاضر ہوئے تو آپ نے مدعی کو قتل کا حکم سنا دیا۔ وہ بہت حیران ہوا کہ بیل بھی میرا اور سزائے موت بھی مجھے ہی سنائی جارہی ہے۔ بہر حال وہ جان گیا کہ داؤد علیہ السلام کو وحی کے ذریعے اصل واقعے کا علم ہو چکا ہے چنانچہ اسے صحیح بات بتانا ہی پڑی کہ آج رات میں نے مدعی علیہ کے باپ کو دھوکے سے قتل کر دیا۔ پس اس کے بدلے اللہ تعالیٰ نے آپ کو قصاص کا حکم دیا ہے، چنانچہ داؤد علیہ السلام نے اس کے قتل کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ اس واقعے کے بعد بنی اسرائیل کے ہر شخص پر آپ کی ہیبت اور بڑھ گئی کہ سبھی پہلے ہی آپ کی فراست اور عقل و شعور کے قائل تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے:

ترجمہ: اور ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کر دیا تھا اور اسے حکمت دی تھی اور بات کا فیصلہ کرنا

ترجمہ: اور بے شک ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور بخشی۔

پیغمبروں کی شان رہی ہے کہ وہ بیت المال سے اپنی خدمات کا معاوضہ یا وظیفہ لینا جائز ہونے کے باوجود مناسب نہیں سمجھتے۔ آپ نے اللہ سے کسبِ حلال کی درخواست کی کہ اے اللہ تعالیٰ میرے لیے کوئی ایسا ذریعہ بنا جس میں، میں اپنے ہاتھ کی کمائی سے رزق حلال حاصل کر سکوں اور دیگر فرائض منصبی زیادہ توجہ کے ساتھ ادا کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا قبول فرمائی اور آپ کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ داؤد علیہ السلام بھیس بدل کر رعایا سے ملتے اور ان سے ان کے حاکم کے متعلق سوال کیا کرتے کہ ان کا بادشاہ کیسا انسان ہے۔ اپنی رعایا کی خبر گیری کرتا ہے یا نہیں۔ عوام اپنے بادشاہ کی تعریفیں کرتے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ آپ کے سوال کے جواب میں ایک آدمی نے اور دوسری روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ایک فرشتے نے جو انسان کی شکل میں تھا، جواب دیا کہ انسان تو اچھا ہے لیکن ایک خامی ہے۔ خامی پوچھی گئی۔ جواب ملا، اپنا اور اہل خانہ کا بوجھ بیت المال پر ڈالے ہوئے ہے، وہیں سے اپنی تمام ضروریات پوری کرتا ہے۔ داؤد علیہ السلام کے جی کو یہ بات لگی۔ گریہ وزاری اور استغفار کے دوران میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے کہ مجھے کوئی ایسا ہنر سکھا دے کہ میں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکوں اور پھر اللہ نے اپنا کرم ایک معجزے کی صورت میں ظاہر کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے:

ترجمہ: اور ہم نے داؤد علیہ السلام علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا۔ بنا زرہیں کشادہ اور اندازہ سے جوڑ کڑیاں اور تم جو کچھ کرتے ہو، میں اس کو دیکھتا ہوں۔

اختصار کی خاطر ان انبیاء کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ باقی شخصیات کے مطالعہ کے لیے تفاسیر اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی کتاب قرآنی شخصیات کا مطالعہ فرمائیں۔

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. قرآن میں مذکور شخصیات کی مختلف اقسام کون سی ہیں؟ ان میں فرق واضح کریں۔
2. قرآن کریم میں بیان کردہ کسی ایک نبی کے حالاتِ زندگی اور ان کی دعوت کا خلاصہ بیان کریں۔
3. قرآن میں جن نیک شخصیات کا ذکر ہے، ان کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کسی ایک شخصیت کی مثال دیں۔
4. قرآن میں بیان کردہ کسی ایک بدکار یا ظالم شخص کا ذکر کریں اور اس کے انجام سے حاصل ہونے والا سبق بیان کریں۔
5. قرآن میں مذکور مختلف شخصیات کے تذکرے کا انسان کی اصلاح اور تربیت میں کیا کردار ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔

یونٹ نمبر: 07

ارض القرآن

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف..... 115

یونٹ کے مقاصد..... 115

ارض القرآن..... 116

مسجد اقصیٰ..... 116

مشعر الحرا..... 17

بابل..... 117

بدر..... 118

باب حطہ..... 119

حجر یا مدائن..... 119

ارض مقدسہ : فلسطین اور سرزمین شام..... 120

حنین..... 121

ارم..... 123

کعبہ (بیت الحرام/بیت العتیق/قدیم گھر)..... 124

غارِ اصحاب کہف..... 125

غار کا مقام..... 126

خود آزمائی..... 128

یونٹ کا تعارف

قرآن مجید نے کثیر تعداد میں مقامات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں شہر، جنگی مقامات، انہار و دریا، مساجد و مقدسات اور پہاڑ وغیرہ شامل ہیں۔ یونٹ ہذا میں ان مقامات سے متعلق قرآنی معلومات کو موضوعاتی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ ایک مقام کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں۔ البتہ موضوع کو طوالت سے بچانے کے لیے کچھ مقامات کا تعارف پیش کرنے کے بعد مزید مطالعہ کے لیے کچھ کتب کی نشاندہی کر دی گئی ہے تاکہ خواہش مند قارئین ان کتب سے استفادہ کر سکیں۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ قرآن میں مذکور مقامات کی مختلف انواع کو جان سکیں۔

2۔ قرآنی مقدس مقامات کے احوال جان سکیں۔

3۔ قرآن میں ایسے مقامات جو انسانیت کے لیے عذاب کی جگہ بنے ان کے احوال جان سکیں۔

ارض القرآن

• مسجد اقصیٰ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر معراج کے دوران مسجد حرام سے یہاں پہنچے تھے اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیا کی نماز کی امامت کرنے کے بعد براق کے ذریعے سات آسمانوں کے سفر پر روانہ ہوئے۔

قرآن مجید کی سورہ الاسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ۔ (سورہ الاسراء آیت نمبر 1)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

احادیث کے مطابق دنیا میں صرف تین مسجدوں کی جانب سفر کرنا باعث برکت ہے جن میں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی شامل ہیں۔ البتہ شیعہ رویات کے مطابق ان تین مساجد کے علاوہ مسجد کوفہ بھی بافضیلت ترین مساجد میں شامل ہے۔ (شیخ صدوق، من لایحضرہ الفقیہ، طبع 1413ھ، ج 1 ص 29)

حضرت ابوذر سے حدیث مروی ہے کہ

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ زمین میں سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟

تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مسجد حرام (بیت اللہ) تو میں نے کہا کہ اس کے بعد کون سی مسجد ہے؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمانے لگے: مسجد اقصیٰ، میں نے سوال کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ چالیس سال، پھر جہاں بھی تمھیں نماز کا وقت آجائے نماز پڑھ لو کیونکہ اسی میں فضیلت ہے۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر 3366، صحیح مسلم حدیث نمبر 520)

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے اور معراج میں نماز کی فرضیت کے بعد 16 سے 17 ماہ تک مسلمان مسجد اقصیٰ کی جانب رخ کر کے ہی نماز ادا کرتے تھے پھر تحویل قبلہ کا حکم آنے کے بعد مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہو گیا۔

• مشعرالحرام

مشعرالحرام عربی زبان کی ایک ترکیب ہے جس کا مفہوم ہے حرمت والا نشان۔ لفظ مشعر واحد اور اس کی جمع مشاعر ہے، درحقیقت یہ اسم ظرف ہے جس کے معنی علامت اور نشان کے ہیں۔ نیز مشاعر الحج کے معنی رسوم حج ادا کرنے کی جگہ کے ہیں، انھیں شعائر الحج بھی کہا جاتا ہے اس کا واحد شعیرہ ہے۔ چنانچہ المشعر الحرام کا مفہوم ہوا حرمت والا نشان حج جس سے مراد مزدلفہ ہے۔ ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُواْ فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُواْ اللّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّآلِّينَ ﴿١٩٨﴾﴾ (سورۃ البقرۃ: 198) اور تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں اگر تم (زمانہ حج میں تجارت کے ذریعے) اپنے رب کا فضل (بھی) تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعر حرام (مُزدلفہ) کے پاس اللہ کا ذکر کیا کرو اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسے اس نے تمھیں ہدایت فرمائی اور بے شک اس سے پہلے تم بھٹکے ہوئے تھے۔

عندالمشعر الحرام کا معنی یہ ہے کہ مزدلفہ اور اس کے آس پاس کا سارا علاقہ اور وادی محسر کو چھوڑ کر تمام مزدلفہ موقوف ہے۔ مشعر الحرام یا مزدلفہ۔ جب عرفات سے منی کی طرف جائیں اور عرفات کے دونوں کنارے چھوڑ دیں تو مزدلفہ شروع ہو جاتا ہے جس کی حد مازمان سے لے کہ محسر تک ہے اور دو پہاڑوں کے درمیان یہ سارا علاقہ مزدلفہ ہے جس کی حد مازمان اور وادی محسر مشعر الحرام میں شامل نہیں۔ حاجی حضرات یہاں مغرب و عشاء کی نمازیں اکٹھی کر کے پڑھتے ہیں۔ حبیب بن ابی ثابت کا بیان ہے کہ عطاء بن ابی رباح سے مشعر حرام میں موقف کے متعلق استفسار کیا گیا، انھوں نے جواباً کہا: کہ بطن وادی محسر کے آگے مزدلفہ کا موقف ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ جبل قزح تک ہے۔ اس کے بعد سارا خطہ مشعر حرام ہے۔

• بابل

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۭ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ (سورۃ البقرۃ: 102)

اور سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین جو کچھ پڑھا کرتے تھے یہ (یہودی) اس کی پیروی کرنے لگ گئے حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین کفر کیا کرتے تھے جو لوگوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتے تھے اور وہ اس (علم) کی بھی پیروی کرنے لگے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل کیا گیا تھا، حالانکہ یہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک اسے خبردار نہ کر لیں کہ (دیکھو) ہم تو صرف آزمائش کے لیے ہیں، کہیں تم کفر اختیار نہ کر لینا، مگر لوگ ان دونوں سے وہ (سحر) سیکھ لیتے تھے جس سے وہ مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان جدائی ڈال دیتے، حالانکہ اذن خدا کے بغیر وہ اس کے ذریعے کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے اور یہ لوگ اس چیز کو سیکھتے تھے جو ان کے لیے ضرر رساں ہو اور فائدہ مند نہ ہو اور بتحقیق انہیں علم ہے کہ جس نے یہ سودا کیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور کاش وہ جان لیتے کہ انہوں نے اپنے نفسوں کا بہت برا سودا کیا ہے۔

بابل قدیم مملکت عراق کا دار الحکومت تھا۔ یہاں کلدانی قوم آباد تھی۔ خیال ہے کہ ان کی سلطنت 3000 ق م میں موجود تھی۔ بابل جہاں تہذیب و تمدن کا مرکز تھا وہاں جادو کا مرکز بھی تھا۔ دنیا میں خرافات کی ابتداء یہیں سے ہوئی۔ احادیث کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں جادو کا عمل عام ہونے لگا تو آپ علیہ السلام نے ان تمام اوراق و اسناد کو ضبط کر لیا جن پر جادو تحریر تھا۔ آپ علیہ السلام کی وفات کے بعد کچھ افراد ان تحریروں کو منظر عام پر لے آئے۔ اس طرح یہودی، وحی الٰہی کی اتباع کی بجائے سفلی علوم کے شیدائی بن گئے، یہودیوں کے ایک فرقے نے یہ نظریہ قائم کیا کہ سلیمان علیہ السلام پیغمبر نہیں تھے بلکہ انہوں نے جادو کے ذریعے جن وانس کو مسخر کر لیا تھا۔ اس زعم باطل کے جواب میں فرمایا : وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

ہاروت اور ماروت دو فرشتوں کے غیر عربی نام ہیں جنہیں ابطال سحر کے لیے انسانی صورت میں بابل بھیجا گیا تھا تاکہ لوگوں میں جادو اور معجزے کا فرق واضح کرنے کے لیے جادو کے مخفی اسباب کو برملا کریں۔ یہودیوں نے یہاں بھی سوء استفادہ کیا اور ان اسباب کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

- **بدر**

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ(123)۔ سورۃ آل عمران

اور بے شک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سر و سامان تھے تو اللہ سے ڈرو کہ کہیں تم شکر گزار ہو۔

یہاں اللہ عَزَّوَجَلَّ اپنے عظیم احسان کو بیان فرما رہا ہے کہ غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں کی تعداد بھی کم

تھی اوران کے پاس ہتھیاروں اور سواروں کی بھی کمی تھی جبکہ کفار تعداد اور جنگی قوت میں مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کفار پر فتح و کامرانی عطا فرمائی۔ جنگ بدر 17 رمضان 2 ہجری میں جمعہ کے دن ہوئی۔ مسلمان 313 تھے جبکہ کفار تقریباً ایک ہزار۔ بدر ایک کنواں ہے جو ایک شخص بدر بن عامر نے کھودا تھا، اس کے نام پر اس علاقے کا نام "بدر" ہو گیا۔) یہ علاقہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ہے۔

بدر مدینہ منورہ سے تقریباً اسی 80 میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نام ہے۔ جہاں زمانہ جاہلیت میں سالانہ میلہ لگتا تھا۔ یہاں ایک کنواں بھی تھا۔ جس کے مالک کا نام "بدر" تھا اسی کے نام پر اس جگہ کا نام "بدر" رکھ دیا گیا۔

- **باب حطہ**

باب حطہ مسجد اقصیٰ کی شمالی جانب ایک دروازہ ہے جو باب الاسباط اور باب الفیصل کے درمیان واقع ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُواْ هَـذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُواْ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَداً وَادْخُلُواْ الْبَابَ سُجَّداً وَقُولُواْ حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ۔ (سورۃ البقرۃ: 58)

اور جب ہم نے انہیں کہا کہ اس شہر میں داخل ہو جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور دروازے میں سجدہ کرتے داخل ہونا اور کہتے رہنا، ہمارے گناہ معاف ہوں، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور عنقریب ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ عطا فرمائیں گے۔

حطۃ کے معنی اترنا، نازل ہونا۔ ای انزلہ اس نے اسے اونچی جگہ سے نیچی جگہ رکھا چنانچہ کہتے ہیں حططت الرحل میں نے سواری سے پاؤں اتار کر نیچے رکھ دیا۔ اور یہاں حطۃ سے مراد یہ ہے حط عنا ذنوبنا (اے اللہ) ہمارے گناہ ہم سے اتار دے (یعنی اپنے گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی دعا کرو)۔

- **حجر یا مدائن**

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ (سورۃ الحجر: 80)

اور (اسی طرح) حجر والوں نے بھی مرسلین کو جھٹلایا

وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ۔ سورۃ الاعراف: 85

اور مدیَن کی طرف ان کی برادری سے شعیب کو بھیجا کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ۔

مدائن صالح سے مراد حضرت صالح علیہ السلام کی نگریاں ہیں۔اسی کا ایک نام الحجر بھی ہے۔مدائن، مدینہ کی جمع قلّت ہے۔مدینہ کا معنی نگری ہے۔

یہ جگہ موجودہ سعودی عرب کے انتظامی خطہ المدیینۃ کے علاقے العلا میں واقع ہے جو ظہور اسلام سے قبل کا ایک انسانی معاشرہ اور تہذیب ہے۔اس قدیم شہر کی اکثر باقیات سلطنت نبطی سے تعلق رکھتی ہیں۔یہ سلطنت کی جنوبی طرف اور پترہ { عربی میں البتراء } جو دار الحکومت تھا، کے بعد سب سے بڑی ہے۔قدیم **لحیان** اور قدیم 'رومی' بادشاہت کے قبضہ جات کے آثار، 'نباتین' سلطنت سے قبل اور بعد کے بھی ملے ہیں۔

قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ 3 تین ہزار قبل مسیح کی ہزاری میں، یہاں پر 'قوم ثمود 'آباد تھی۔اسلامی عبارات اور معلومات کے مطابق قوم ثمود جس نے پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے تھے، ان کی بت پرستی اور اس پر اٹل قائم رہنے اور حضرت صالح علیہ السلام جن کو اس قوم کی طرف اللہ نے نبی بنا کر ہدایت و راہنمائی کے لیے بھیجا کو خفیہ طور پر قتل کرنے اور حق و ہدایت کی راہ نہ اختیار کرنے کے عزائم پر اللہ تعالیٰ نے زلزلہ اور سخت بجلی و گرج چمک کے برساو کے ساتھ بطور سزا کے عذاب نازل کیا۔اور قوم ثمود کے نافرمان لوگ نیست و نابود ہو گئے۔ یوں مدائن صالح والی جگہ اسی وقت عذاب الہی سے اللہ کے غضب و قہر کی عبرتناک نشانی بن گئی۔ سعودی عرب کی حکومت 1972ء سے اس شہر کو اس کی اس تاریخی حیثیت سے ہٹ کر اسے سیاحت و تفریح کی کشش کے لیے مدائن صالح کے طور سے فروغ دے رہی ہے اور اس کو قومی تہذیبی تشخص کی حیثیت سے محفوظ کیا گیا ہے۔قدیم مٹی ہوئی تہذیب 'سلطنت نباتین' کے انتہائی محفوظ حالت میں موجود خاص کر 131 پتھروں کے تراشیدہ گھر اور ان کے بیرونی داخلی دروازوں کو، سنہ 2008ء میں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے اسے سعودی عرب کی پہلی عالمی ورثہ کی جگہ قرار دیا ہے۔

• ارض مقدسہ: فلسطین اور سرزمین شام

ارض مقدسہ یا مقدس سرزمین جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں آیا ہے:

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۔ (سورۃ المائدۃ:21)

ترجمہ: "اے میری قوم! داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اور نہ پیچھے ہٹو پیٹھ پھیرتے ہوئے ورنہ تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے"

دیارِ مقدسہ یا ارضِ مقدسہ اس خطے کو کہا جاتا ہے جو دریائے اردن اور بحیرہ روم کا درمیانی علاقہ جس میں دریائے اردن کا مشرقی علاقہ بھی شامل ہے۔ کتاب مقدس کے مطابق روایتی طور پر اسے ارض اسرائیل اور تاریخی طور پر فلسطین سے جانا جاتا ہے۔

اصطلاح سے موجودہ دور میں جدید ریاست اسرائیل، فلسطینی علاقہ جات، اردن، لبنان اور جنوب مغربی سوریہ کا علاقہ مراد ہے۔ یہ یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں کے لیے مقدس ہے۔

ان الفاظ میں موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو ارض مقدسہ میں داخل ہونے سے قبل حکم دیا ہے۔ ارض مقدسہ کے متعلق کئی اقوال ہیں۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد طور اور اس کے ارد گرد کی زمین ہے۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد شام ہے۔ ابن زید نے کہا اس سے مراد اریحا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد دمشق، فلسطین اور اردن کا بعض علاقہ ہے۔

امام ابو جعفر طبری نے کہا ہے کہ ارض مقدسہ کو عموم اور اطلاق پر رکھنا چاہیے اور اس کو کسی علاقہ کے ساتھ خاص نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بغیر کسی حدیث کے ارض مقدسہ کی تعیین جائز نہیں ہے اور اس سلسلہ میں کوئی حدیث وارد نہیں ہے۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے کہا ہے کہ اس سے مراد سرزمین فلسطین ہے۔ اس کو مقدس اس لیے فرمایا ہے کہ یہ جگہ شرک سے پاک ہے، کیونکہ یہ جگہ انبیا علیہم السلام کا مسکن ہے، یا اس لیے کہ اس جگہ عبادت کرنے سے انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مجاہد کے نزدیک ارض مقدس سے مراد طور اور حوالی طور ہے۔ ضحاک کے نزدیک ایلیا اور بیت مقدس، عکرمہ اور سدی کے نزدیک اریحا۔ کلبی کے نزدیک دمشق فلسطین اور اردن کا کچھ حصہ اور قتادہ کے نزدیک پورا ملک شام۔ حضرت کعب کا بیان ہے کہ میں نے اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب (یعنی تورات) میں پڑھا تھا کہ شام اللہ کی زمین کا خزانہ ہے اور شام کے رہنے والے اللہ کے بندوں میں خزانہ ہیں۔ مقدسہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ارض مذکور انبیا کی قرار گاہ اور اہل ایمان کا مسکن ہے۔

- **حنین**

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍۙ-وَّ یَوْمَ حُنَیْنٍۙ-اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْــٴًـا (سورۃ التوبہ:25)

بے شک اللہ نے بہت سے مقامات میں تمہاری مدد فرمائی اور حنین کے دن کو یاد کرو جب تمہاری کثرت نے تمہیں خود پسندی میں مبتلا کر دیا تو یہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آئی۔

حُنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ جہاں بنو ہوازن اور بنو ثقیف نام کے دو قبیلے آباد تھے۔ یہاں شوال 8ھ بمطابق جنوری، فروری630 ء میں زبردست جنگ ہوئی۔واقعہ کی تفصیل سیرت حلبیہ میں یوں بیان ہوئی ہے:

مقامِ حُنَین میں ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' نام کے دو قبیلے آباد تھے جو بہت ہی جنگجو اور فُنونِ جنگ سے واقف تھے۔ان لوگوں پر فتحِ مکہ کا اُلٹا اثر پڑا اور ان لوگوں پر جاہلیت کی غیرت سوار ہو گئی اور ان لوگوں نے یہ خیال قائم کر لیا کہ فتحِ مکہ کے بعد ہماری باری ہے اس لئے ان لوگوں نے یہ طے کر لیا کہ مسلمانوں پر جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں ایک زبردست حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حضور پُر نور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو تحقیقات کے لئے بھیجا۔جب انہوں نے وہاں سے واپس آکر ان قبائل کی جنگی تیاریوں کا حال بیان کیا اور بتایا کہ قبیلہ ہوازن اور ثقیف نے اپنے تمام قبائل کو جمع کر لیا ہے اور قبیلہ ہوازن کا رئیسِ اعظم مالک بن عوف ان تمام اَفواج کا سپہ سالار ہے اور وہ سو برس سے زائد عمر کا بوڑھا ہے۔ ''درید بن الصمہ'' جو عرب کا مشہور شاعر اور مانا ہوا بہادر تھا بطور مشیر کے میدانِ جنگ میں لایا گیا ہے اور یہ لوگ اپنی عورتوں بچوں بلکہ جانوروں تک کو میدانِ جنگ میں لائے ہیں تاکہ کوئی سپاہی میدان سے بھاگنے کا خیال بھی نہ کر سکے۔ حضورِ اقدس صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے بھی شوال8 ھ میں بارہ ہزار کا لشکر جمع فرمایا۔ دس ہزار تو مہاجرین و انصار وغیرہ کا وہ لشکر تھا جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آیا تھا اور دو ہزار نو مسلم تھے جو فتحِ مکہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اس لشکر کو ساتھ لے کر اس شان و شوکت کے ساتھ حنین کا رُخ کیا کہ اسلامی افواج کی کثرت اور اس کے جاہ و جلال کو دیکھ کر بے اختیار بعض صحابۂ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُم کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا کہ ''آج بھلا ہم پر کون غالب آ سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ان حضرات کا اپنی فوجوں کی کثرت پر ناز کرنا پسند نہیں آیا۔ چنانچہ اس فخر و نازِش کا یہ انجام ہوا کہ پہلے ہی حملہ میں قبیلہ ہوازن و ثقیف کے تیر اندازوں نے جو تیروں کی بارش کی اور ہزاروں کی تعداد میں تلواریں لے کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تو وہ دو ہزار نو مسلم اور کفارِ مکہ جو لشکرِ اسلام میں شامل ہو کر مکہ سے آئے تھے ایک دم سر پر پیر رکھ کر بھاگ نکلے۔ ان لوگوں کی بھگدڑ دیکھ کر انصار و مہاجرین کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔

حضور تاجدارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو گنتی کے چند جاں نثاروں کے سوا سب فرار ہو چکے تھے۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ بارہ ہزار کا لشکر فرار ہو چکا تھا مگر خدا عَزَّوَجَلَّ کے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے پائے اِستقامت میں بال برابر بھی لغزش نہیں ہوئی۔ بلکہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اکیلے ایک لشکر بلکہ ایک عالمِ کائنات کا مجموعہ بنے ہوئے نہ صرف پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے بلکہ اپنے سفید خچر پر سوار برابر آگے ہی بڑھتے رہے اور آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے کہ

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

میں نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں ہے میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

حضرت عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ چونکہ بہت ہی بلند آواز تھے اس لئے آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے انہیں حکم دیا کہ انصار و مہاجرین کو پکارو۔ انہوں نے جو " یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَار" اور " یَا لِلْمُھَاجِرِیْنَ" کا نعرہ مارا تو ایک دم تمام فوجیں پلٹ پڑیں اور لوگ اس قدر تیزی کے ساتھ دوڑ پڑے کہ جن لوگوں کے گھوڑے اِژدِحام کی وجہ سے نہ مڑ سکے انہوں نے ہلکا ہونے کے لئے اپنی زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود کود کر دوڑے اور کفار کے لشکر پر جھپٹ پڑے اور اس طرح جانبازی کے ساتھ لڑنے لگے کہ دم زدن میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ کفار بھاگ نکلے، کچھ قتل ہو گئے اور جو رہ گئے گرفتار ہو گئے۔ قبیلہ ثقیف کی فوجیں بڑی بہادری کے ساتھ جم کر مسلمانوں سے لڑتی رہیں یہاں تک کہ ان کے ستر بہادر کٹ گئے، لیکن جب ان کا علمبردار عثمان بن عبداللہ قتل ہو گیا تو ان کے پاؤں بھی اُکھڑ گئے۔ اور فتحِ مُبین نے حضور رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے قدموں کا بوسہ لیا اور کثیر تعداد و مقدار میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ (سیرت حلبیہ، باب ذکر مغازیہ صلی اللہ علیہ وسلم، غزوۃ حنین، ۳/۱۵۱-۱۵۵، مدارج النبوہ، قسم سوم، باب ہشتم: ذکر وقائع سال ہشتم وغزوہ حنین، ۲/۳۰۸-۳۱۴، شرح الزرقانی، غزوۃ حنین، ۳/۵۳۱-۵۳۲، ملتقطاً)

- **ارم**

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ() اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ() الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ() (سورۃ الفجر: 6، 7، 8)

کیا تم نے نہ دیکھا تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیسا کیا وہ اِرَم حد سے زیادہ طول والے کہ ان جیسا شہروں میں پیدا نہ ہو۔

ارم ذات العماد (ارم ستونوں والا شہر) یا زبانِ عام میں صرف ارم) عربی میں اِرَم ذات

العماد اور انگریزی میں Irem, Ubar, Wabar یا (Iram of the Pillars)قدیم عرب قوم عاد کے مرکزی شہر کا نام تھا۔ یہ شہر طوفانِ نوح کے کافی بعد بسا اور زبردست ترقی کر گیا۔ اس وقت لوگ طوفانِ نوح کو بھول کر دوبارہ شرک اور بت پرستی کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ اس قوم پر حضرت ھود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ جب اس قوم نے شرک اور بت پرستی ترک نہ کی تو اللہ نے عذاب نازل کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اس قوم کے تذکرے کو کہانی سمجھا جاتا تھا مگر اسی صدی میں اس شہر کے آثار برآمد ہوئے ہیں جو الربع الخالی کے اس حصے میں ہے جو آج کل عمان میں شامل ہے۔ اس کے آثار 1984 میں خلائی شٹل چیلینجر کی مدد سے دریافت کیے گئے۔ یہ شہر 3000 سال قبل مسیح سے لے کر پہلی صدی عیسوی تک اونٹوں کے اس کاروانی راستے پر آباد تھا جہاں سے ھند، عرب اور یورپ تک تجارت کی جاتی تھی اور یہ اپنے زمانے کا ایک تجارتی مرکز تھا۔ روایت ہے کہ یہ شہر ایک عظیم طوفان سے تباہ ہوا۔ اسے ایک ہزار ستونوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اس کے ستون بہت اونچے تھے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ارم اس جنت کا نام ہے جو عاد کے بیٹے شداد بن عاد نے بنائی تھی اور اسی کی صفت ذات العماد ہے کہ وہ ایک عظیم الشان عمارت بہت سے عمودوں پر قائم ہونے چاندی اور جواہرات سے تعمیر کی تھی تاکہ لوگ آخرت کی جنت کے بدلے اس نقد جنت کو اختیار کر لیں مگر جب یہ عالیشان محلات تیار ہو گئے اور شداد نے اپنے روسائے مملکت کی معیت میں اس جنت میں جانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا یہ سب ہلاک ہو گئے اور وہ محلات بھی مسمار ہو گئے (قرطبیؒ) شداد نے جنت کا ذکر سنا تو کہنے لگا میں ایسی جنت بناتا ہوں۔ اس نے عدن کے کسی صحرا میں ارم شہر تین سو سال میں بنوایا۔ اس کی عمر نو سو سال تھی۔ یہ بہت بڑا شہر تھا۔ اس کے مکانات سونے چاندی کے بنے تھے۔ اور زبرجد و یاقوت کے ستون عمارات کے اندر دیے گئے۔ اس میں قسم قسم کے درخت اور نہریں بھی تھیں۔ جب اس کی تعمیر مکمل ہو چکی تو وہ اہل مملکت کو لے کر اس کی طرف چل دیا۔ جب ایک دن رات کا سفر رہ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان سے چیخ بھیج کر ہلاک کر دیا۔

• کعبہ (بیت الحرام/بیت العتیق/قدیم گھر)

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ- (سورۃ المائدۃ: 97)

خانہ کعبہ، کعبہ یا بیت اللہ) عربی :الکعبۃ المشرفۃ، البیت العتیق یا البیت الحرام (مسجد حرام کے وسط میں واقع ایک عمارت ہے، جو مسلمانوں کا قبلہ ہے، جس کی طرف رخ کر کے وہ عبادت کیا کرتے ہیں۔ یہ دین اسلام کا

مقدس ترین مقام ہے۔ صاحب حیثیت مسلمانوں پر زندگی میں ایک مرتبہ بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے۔

اللہ عَزَّوَجَلَّ نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے قیام کا باعث بنایا کہ وہاں دینی اور دنیوی اُمور کا قیام ہوتا ہے، خوفزدہ وہاں پناہ لیتا ہے، ضعیفوں کو وہاں امن ملتا ہے، تاجر وہاں نفع پاتے ہیں اور حج و عمرہ کرنے والے وہاں حاضر ہو کر مناسک ادا کرتے ہیں لہٰذا یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بڑی نعمت ہے۔ یونہی ذی الحجہ جس میں حج کیا جاتا ہے اور ہدی کے جانور ان سب کے ساتھ بھی دینی اور دنیاوی امور وابستہ ہیں کہ اس کے گوشت سے غریبوں اور امیروں کا گزارہ ہوتا ہے اور اس سے ایک رکنِ اسلامی ادا ہوتا ہے۔

• غارِ اصحاب کہف

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (سورۃ الکہف : 9) کیا تمہیں معلوم ہوا کہ پہاڑی غار اور جنگل کے کنارے والے وہ ہماری نشانیوں میں سے ایک عجیب نشانی تھے۔

الرقیم۔ حضرت مرہؒ سے الرقیم کے بارے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا : کعب کا خیال ہے کہ یہ وہ گاؤں ہے جس سے وہ اصحاب کہف نکلے تھے۔ حضرت مجاہدؒ نے کہا ہے : الرقیم سے مراد وادی ہے۔ اور حضرت سدیؒ نے کہا ہے کہ الرقیم سے مراد وہ چٹان ہے جو اس غار پر تھی۔ اور ابن زیدؒ نے کہا ہے : الرقیم وہ کتاب ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہم پر غالب کر دیا، لیکن اس کے واقعہ کی ہمارے سامنے وضاحت نہ کی اور ایک گروہ نے کہا ہے : الرقیم سے مراد وہ تحریر ہے جو تانبے کی تختی میں لکھی ہوئی تھی۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے : تانبے کی ایک تختی میں قوم کفار نے ان نوجوانوں کا واقعہ لکھا تھا جو ان سے بھاگے تھے اور انھوں نے اسے ان کی تاریخ بنا دیا، انھوں نے ان کے گم ہونے کا وقت ذکر کیا، ان کی تعداد ذکر کی ہے کہ وہ کتنے تھے اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ کون تھے ؟ اور اسی طرح فراء نے کہا ہے، انھوں نے بیان کیا ہے : رقیم تانبے کی ایک تختی ہے جس میں ان کے اسماء ان کے نسب، ان کا دین اور جس سے وہ بھاگے تھے سب لکھا ہوا تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے : ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسی قوم سے تھے جو واقعات اور حوادث کی تاریخ لکھتے تھے اور یہ مملکت کی فضیلت ہے اور یہ مفید کام ہے۔ اور یہ اقوال الرقیم سے ماخوذ ہیں اور اسی سے "کتاب مرقوم" (لکھی ہوئی کتاب) ہے۔

آیات میں اصحاب کہف کی حالت کا بیان فرمایا ہے جو غار میں داخل ہونے کے بعد پیش آئی، یہ لوگ غار کے اندر ایک کشادہ جگہ میں پہنچ کر لیٹ گئے، اس غار کی جائے وقوع اس طرح سے تھی کہ روزانہ سورج مشرق سے نکلتا اور مغرب میں چھپ جاتا تھا لیکن اس کی دھوپ ان پر نہیں پڑتی تھی جب سورج نکل کر چڑھتا تھا اور دھوپ پھیلتی

تھی تو غار کی داہنی جانب سے اس طرح ہٹی ہوئی رہ جاتی تھی کہ اس کے دروازہ تک نہ پہنچتی تھی اور جب سورج چھپنے لگتا تھا تو اس وقت جو تھوڑی بہت دھوپ ہوتی ہے وہ غار کی بائیں جانب رہ جاتی تھی یعنی اس وقت بھی دروازہ پر دھوپ نہ پڑتی تھی۔ اصحاب کہف کے اندر رہنے کی کیفیت بتا کر ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اپنی قوم سے جدا ہونے میں انھوں نے ہمت اور جرات سے کام لیا پھر اللہ کے توکل پر غار میں داخل ہو گئے اور اللہ سے رحمت کی امید باندھ لی اور اللہ کی طرف سے آسانی حاصل ہونے کی آرزو کرتے ہوئے غار میں چلے گئے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے، اس نے دل بھی پکا کیا ہمت بھی دی مخلوق سے کٹنے کا حوصلہ بھی دیا انھوں نے اسباب ظاہرہ پر نظر نہ کی، اپنے مولائے حقیقی پر توکل کر کے غار میں داخل ہو گئے اللہ تعالیٰ نے انھیں غار بھی وہ نصیب فرمایا جس میں دھوپ کا گذر ہی نہ تھا اگر دھوپ پڑتی تو اس سے تکلیف پہنچنے اور گرمی سے پریشان ہونے کا اندیشہ تھا۔

غار کا مقام

امام تفسیر ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباس ؓ سے نقل کیا ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جو فلسطین سے نیچے ایلہ (عقبہ) کے قریب ہے اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور چند دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ رقیم کیا ہے، لیکن میں نے کعب احبار سے پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ رقیم اس بستی کا نام ہے جس میں اصحاب کہف غار میں جانے سے پہلے مقیم تھے۔

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت معاویہ ؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلے میں ایک جہاد کیا جس کو غزوۃ المضیق کہتے ہیں، اس موقع پر ہمارا گذر اس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ غار کے اندر جائیں اور اصحاب کہف کی لاشوں کا مشاہدہ کریں، مگر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مشاہدہ کرنے سے اس ہستی کو بھی منع کر دیا ہے جو آپ سے بہتر تھی، یعنی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیونکہ حق تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا (آیت) لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (یعنی اگر آپ ان کو دیکھیں تو آپ ان سے بھاگیں گے اور رعب وہیبت سے مغلوب ہو جائیں گے) مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی اس بات کو شاید اس لیے قبول نہیں کیا کہ قرآن کریم نے ان کی جو حالت

بیان کی ہے یہ وہ ہے جو ان کی زندگی کے وقت تھی یہ کیا ضروری ہے کی اب بھی وہی حالت ہو، اس لیے کچھ آدمیوں کو دیکھنے کے لیے بھیجا، وہ غار پر پہنچے، مگر جب غار میں داخل ہونا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت ہوا بھیج دی جس نے ان سب کو غار سے نکال دیا - مذکور الصدر روایات و حکایات سے اتنی بات ثابت ہوئی کہ حضرات مفسرین میں سے جن حضرات نے اصحاب کہف کے غار کی جگہ کا پتہ دیا ہے ان کے اقوال تین مقامات کا پتہ دیتے ہیں، ایک خلیج فارس کے ساحل عقبہ (ایلہ) کے قریب، حضرت ابن عباسؓ کی بیشتر روایات اسی کی تائید میں ہیں، جیسا کہ مذکورہ روایات میں گذر چکا ہے۔

کچھ منتخب مقامات کو نمونہ کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ مزید مقامات کی معلومات کے لیے عبدالماجد دریاآبادی اور سید سلیمان ندوی کی کتاب ''ارض القرآن'' کا مطالعہ کریں۔ دونوں کتابیں انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ تلاش میں مدد کے لیے کچھ مزید قرآنی مقامات کی نشاندہی ذیل میں کر دی گئی ہے۔

مجمع البحرین، مکہ (ام القراء، بلد امین، بکہ)، مقام ابراہیم، مسجد ضرار، مسجد الحرام، جودی پہاڑ، الرس، سبا، صفا و مروہ، طور، سینا' / کوہ سینا اور کوہ طور، مصر، وادی طوی، انطاکیہ (تاریخی شہر)، انطاکیہ، ایلہ، سد ذوالقرنین، یروشلم اور اریحا، کالا پتھر (الحجر الاسود، غار حرا اور غار ثور، حدیبیہ، مسجد نبوی (نبی کی مسجد)، بین النہرین، دریائے نیل، نینوا، دریائے فلسطین، مسجد قباء، صحرائے سینا اور صحرائے تیہ، طائف، غزوہ خیبر، غزوہ تبوک، غزوہ خندق، غزوہ احد

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. قرآن میں مذکور مقامات کو کن مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔
2. قرآن مجید میں کن مقدس مقامات کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کی کیا اہمیت ہے؟ کسی ایک مقام کی تفصیل بیان کریں۔
3. ایسے مقامات جنہیں اللہ تعالیٰ نے عذاب کی جگہ بنا دیا، ان میں سے کسی ایک کا ذکر کریں اور اس کے انجام سے حاصل ہونے والا سبق بیان کریں۔
4. قرآن میں مکہ مکرمہ اور بیت المقدس کی فضیلت کو کس طرح بیان کیا گیا ہے؟ کم از کم ایک آیت کے حوالے سے وضاحت کریں۔
5. قرآن میں مذکور تاریخی مقامات کے تذکرے کا انسان کے ایمان اور اعمال پر کیا اثر پڑتا ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔

یونٹ نمبر: 08

قرآن کریم اور نظریہ تخلیق کائنات

جمع و ترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 131
یونٹ کے مقاصد 131
قرآن کریم اور نظریہ تخلیق کائنات 132
تخلیقِ کائنات 132
عظیم دھماکے کا نظریہ (Big Bang theory) 132
اِبتدائی دھماکے کا قرآنی نظریہ 136
قرآن اور نظریۂ اِضافیت (Theory of Relativity) 138
تخلیقِ زمین اور اُس کا فطری اِرتقاء 142
مراحلِ تخلیقِ اَرض 143
مرحلۂ مابعدِ ظہورِ حیات 314
سائنسی تحقیقات اور چار اَدوار 144
مرحلۂ ماقبلِ عہدِ حجری Proterozoic Era 144
مرحلۂ حیاتِ قدیم Paleozoic Era 144
مرحلۂ حیاتِ وُسطیٰ Mesozoic Era 145
مرحلۂ حیاتِ جدید Cainozoic Era 145
زمینی زندگی کا پانی سے آغاز 146
خود آزمائی 148

یونٹ کا تعارف

قرآن مجید میں تخلیق کائنات کو سینکڑوں آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات میں اپنی کاریگری کو بیان کر کے انسان کو اپنی ذات کا تعارف کروانا چاہتا ہے تا کہ انسان راہ ہدایت پر ہی رہے۔ یونٹ ہذا میں نظریہ تخلیق کائنات کو سائنس کی روشنی میں بیان کر کے قرآنی شواہد بھی بیان کیے گئے ہیں اور جہاں سائنس کا نظریہ غلطی یا گومگو کا شکار ہوا اس حوالہ سے قرآن کی روشنی میں درست سمت کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ قرآن میں مذکور ان آیات کو جان سکیں گے جن کی روشنی میں تخلیق کائنات کا راز افشاں ہوتا ہے۔

2۔ کائنات کی تخلیق کے احوال جان سکیں۔

3۔ قرآن کی روشنی میں کائنات کی تخلیق کا مقصد جان سکیں۔

قرآن کریم اور نظریہ تخلیق کائنات

تخلیقِ کائنات

تخلیقِ کائنات کے قرآنی اُصولوں میں سے ایک بنیادی اُصول یہ ہے کہ اِبتدائے خلق کے وقت کائنات کا تمام بنیادی مواد ایک اِکائی کی صورت میں موجود تھا، جسے بعد ازاں پارہ پارہ کرتے ہوئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اِس سے کائنات میں توسیع کا عمل شروع ہوا جو ہنوز جاری و ساری ہے۔

قرآنِ مجید اِس حقیقت کو اِن اَلفاظ میں بیان کرتا ہے :

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا. (الانبياء، 21 : 30)

اور کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اِکائی (singularity) کی شکل میں جڑے ہوئے تھے، پس ہم نے اُنہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔

اِس آیتِ کریمہ میں دو اَلفاظ ''رَتْق'' اور ''فَتْق'' خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ 'رَتْق' کے معنی کسی شے کو ہم جنس مواد پیدا کرنے کے لئے ملانے اور باندھنے کے ہیں۔ 'فَتْق' متضاد ہے 'رَتْق' کا، جس کا معنی توڑنے، جدا کرنے اور الگ الگ کرنے کا عمل ہے۔ قرآنِ مجید نے آج سے 14 صدیاں قبل تخلیقِ کائنات کی یہ حقیقت عرب کے ایک جاہل معاشرے میں بیان کر دی تھی اور لوگوں کو یہ دعوتِ فکر دی تھی کہ وہ اِس حقیقت کے بارے میں سوچیں۔ صدیوں کی تحقیق کے بعد بیسویں صدی کے وسط میں جدید علمِ تخلیقیات (cosmology)، علمِ فلکیات (astronomy) اور علمِ فلکی طبیعیات (astrophysics) کے ماہرین نے بالکل وُہی نظریہ منظرِ عام پر پیش کیا ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک 'صفر درجہ جسامت کی اِکائیت' سے ہوئی۔ 'عظیم دھماکے کا نظریہ' (Big Bang Theory) اسی کی معقول تشریح و توضیح ہے۔

عظیم دھماکے کا نظریہ (Big Bang theory)

کائنات کی اوّلیں تخلیق کے وقت اُس کا تمام مادّہ ایک اِکائی (minute cosmic egg) کی صورت میں موجود تھا، پھر اللہ ربّ العزت نے اُس اِکائی کو پھوڑا اور اُس کے نتیجے میں اِس کائناتِ پست و بالا کو وُجود ملا۔ قرآنِ مجید کے 'نظریۂ تخلیقِ کائنات' کے مطالعہ سے پہلے ہم کائنات کی تخلیق سے متعلقہ سائنسی تحقیقات کے اِرتقاء کی طویل جدوجہد کا مختصر ذِکر ضروری سمجھیں گے تاکہ قارئین کو اِسلامی اِعتقادات کی حقّانیت کو سمجھنے میں آسانی ہو :

- 1687ء میں مشہور و معروف برطانوی سائنسدان 'آئزک نیوٹن (Isaac Newton)' نے تجاذُب کا کائناتی تصوّر پیش کرتے ہوئے کہا کہ کائنات جامد اور غیر مُتغیّر ہے۔ یہ بات بیسویں صدی تک ایک مصدقہ حقیقت کے رُوپ میں تسلیم کی جاتی رہی۔
- 1915ء میں 'البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein)' نے 'عمومی نظریۂ اِضافیت' (General Theory of Relativity) پیش کیا۔ اُس نظریئے میں اُس نے مادّے، توانائی، کشش، مکان اور زمان میں باہمی نسبت کی وضاحت کی۔ اُس نے 'نیوٹن' کا جمودِ کائنات کا تصوّر تو کسی حد تک ردّ کر دیا لیکن وہ خود کائنات کی اصلیت کے بارے میں کوئی نیا نظریہ دینے سے قاصر رہا کیونکہ نیوٹن کے نظریات کو اُس وقت تک دُنیا بھر میں غیر متبدّل سمجھا جا رہا تھا۔
- 1929ء میں 'ایڈوِن ہبل (Edwin Hubble)' نے پہلی بار یہ مفروضہ پیش کیا کہ کائنات جامد اور غیر متغیر نہیں ہے، بلکہ حرکت پذیر ہونے کے علاوہ شاید وہ مسلسل وسیع بھی ہو رہی ہے۔ اُس کی تحقیق نے 'عظیم دھماکے کے نظریئے (Big Bang Theory)' کو جنم دیا۔ عظیم دھماکے کے نظریئے کو اِبتدائی طور پر 'مارٹن ریلے (Martin Ryle)' اور 'ایلن آر سنڈیج (Allan R. Sandage)' نے پروان چڑھایا۔
- 1965ء میں دو امریکی سائنسدانوں 'آرنو پنزیاس (Arno Penzias)' اور 'رابرٹ وِلسن' (Robert Wilson) نے اپنے معمول کے تجربات کے دوران اِتفاقاً کائناتی پس منظر کی شعاع ریزی' (cosmic background radiation) دریافت کی، جس سے یہ ثابت ہوا کہ مادّی کائنات کا آغاز ایک اِکائی سے ہوا تھا۔ اُس اِکائی کو اُنہوں نے 'مختصر ترین کائناتی انڈے (minute cosmic egg)' کے نام سے موسوم کیا، جو اپنے اندر بے پناہ توانائی کو سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ اچانک پھٹا اور اُس کے نتیجے میں اِس کائنات کا مختلف اُلاقسام مادّہ تخلیق پایا اور اُسی سے بعد ازاں مختلف کلسٹرز اور کہکشائیں تخلیق پائیں۔

چار ایسی بنیادی طاقتیں جو مختلف اَجرامِ فلکی کے اپنے اپنے کروں میں موجود ہوتی ہیں، وہ بھی اُس دھماکے کے ساتھ ہی معرضِ وُجود میں آ گئیں۔ وہ طاقتیں یہ ہیں:

1. کششِ ثقل (gravity)
2. برقی مقناطیسیت (electromagnetism)
3. طاقتور نیوکلیائی طاقتیں (strong nuclear forces)
4. کمزور نیوکلیائی طاقتیں (weak nuclear forces)

موجودہ سائنسی تحقیقات کے محتاط اندازوں کے مطابق اَب تک اِس کائنات کو تخلیق ہوئے کم و بیش 15 ارب سال گزر چکے ہیں۔ آج سے 15 ارب سال پہلے پائی جانے والی اُس اِبتدائی کمیّتی اِکائی سے پہلے وہ کیا شے تھی جس سے یہ کائنات ایک دھماکے کی صورت میں تخلیق کی گئی؟ سائنس اِس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اِس مُعمّے کا حل قرآنِ مجید کے اِس فرمان پر اِیمان لانے سے ہی ممکن ہے:

إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ (مریم، 19:35)

جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو اُسے صرف یہی حکم دیتا ہے: ''ہو جا''، بس وہ ہو جاتا ہے۔

قرآنی اِصطلاح ''رَتق'' کی سائنسی تفسیر ہمیں اِس بات سے آگاہ کرتی ہے کہ بے پناہ توانائی نے کائنات کو اُس وقت 'اِبتدائی کمیتی اِکائی' کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ وہ ایک ناقابلِ تصوّر حد تک کثیف اور گرم مقام تھا جسے 'اِکائیت' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اُس وقت کائنات کی کثافت اور خلائی وقت کا اِنحناء (curvature) دونوں لامحدُود تھے اور کائنات کی جسامت صفر تھی۔ اِکائیت کی اُس حالت اور صفر درجہ جسامت (zero volume) کی طرف قرآنِ مجید یوں اِشارہ کرتا ہے:

أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا. (الانبیاء، 21:30)

جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اِکائی (singularity) کی شکل میں جڑے ہوئے تھے۔

اِن الفاظ میں بگ بینگ سے پہلے کا ذِکر کیا گیا ہے۔ پھر اُس کے بعد پُھوٹنے اور پھیلنے کا عمل شروع ہوا، جسے کلامِ مجید نے اِن اَلفاظ میں ذِکر کیا ہے: فَفَتَقْنَاهُمَا. (الانبیاء، 21:30)

پس ہم نے اُنہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔

عظیم دھماکے (Big Bang) سے رُونپذیر ہونے والے عملِ اِنشقاق (پھٹنے کے عمل) کے آغاز کے ساتھ ہی ایک سیکنڈ کے سوویں حصے (hundredth part) میں وہ 'اِکائیت' پھیل کر اِبتدائی آگ کا گولا (primordial fireball) بن گئی اور دھماکے کے فوری بعد اُس کا درجۂ حرارت ایک کھرب سے ایک کھرب 80 ارب سینٹی گریڈ کے درمیان جا پہنچا۔ تاہم عظیم دھماکے سے ایک منٹ بعد ہی کائنات کا درجۂ حرارت تیزی سے گرتے ہوئے دس گنا کم ہو کر 10 ارب سے 18 ارب سینٹی گریڈ کے درمیان آن پہنچا۔ یہ سورج کے مرکز کے موجودہ درجۂ حرارت سے تقریباً ایک ہزار گنا زیادہ حرارت تھی۔ اُس وقت کائنات زیادہ تر فوٹان، اِلیکٹران، نیوٹریناس اور اُس کے مخالف ذرّات کے ساتھ ساتھ کسی حد تک پروٹان اور نیوٹران پر مشتمل تھی۔

کائنات کے اُس اوّلین مرحلے کی تصویر کشی سب سے پہلے 'جارج گیمو' (George Gamow) نامی سائنسدان نے 1948ء میں تصنیف کردہ اپنی مشہور تحریر میں پیش کی۔ اُس نے کہا کہ 'عظیم دھماکے' (Big Bang) کے معاً بعد کائنات اِتنی شدید گرم تھی کہ ہر طرف 'نیوکلیائی حرارتی تعاملات' (thermonuclear radiations) شروع ہو سکیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اِبتدائی کائنات زیادہ توانائی کے حامل خُورد موجی (short-wave) فوٹانز سے معمور تھی۔ اُس نے ایک قابلِ قدر پیشینگوئی کی کہ کائنات کی اِبتدائی بے حد گرم حالتوں میں فوٹانز کی صورت میں پائی جانے والی شعاع ریزی (radiation) کو اَب بھی اپنے نسبتاً کم درجۂ حرارت کے ساتھ جاری ہونا چاہیئے، جو مطلق صفر (273°- سینٹی گریڈ) سے محض چند درجے زیادہ ہو۔ اسی شعاع ریزی کو بعد اَزاں 1965ء میں 'آرنو پینزیاس' اور 'رابرٹ وِلسن' نے دریافت کیا۔ جوں جوں کائنات میں وُسعت کا عمل جاری ہے اُس کا درجۂ حرارت گِرتا چلا جا رہا ہے۔ فی الحال کائنات کا اَوسط درجۂ حرارت 270°- سینٹی گریڈ تک کم ہو چکا ہے، جو مطلق صفر سے محض 3 درجہ اُوپر ہے۔ مطلق صفر (یعنی 273.16°-) وہ درجۂ حرارت ہے جہاں مالیکیولز کی ہر طرح کی حرکت منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔

'جارج لویٹر' (George Lawaitre) نے 1931ء میں اِس بات کی طرف اِشارہ کیا کہ اگر تمام کہکشاؤں کے باہر کی سمت پھیلاؤ کا تعاقب کیا جائے اور اُس میں چھپے حقائق پر غور و فکر کیا جائے تو یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ وہ سب دوبارہ اُسی نقطے پر آن ملیں جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ مادّے کا وہ بڑا قطرہ جو اِبتدائی ایٹم (primeval atom) کے نام سے جانا جاتا ہے، یقیناً ماضی بعید میں طبیعی کائنات کے طور پر پایا جانے والا کائناتی انڈہ (cosmic egg) تھا۔ 'لویٹر' نے یہ مفروضہ پیش کیا کہ مادّے کا وہ بڑا قطرہ کسی وجہ سے پھٹ گیا اور ایک بم کی طرح باہر کی طرف ہر سُو اُڑ نکلا۔ یہی کائنات کی اوّلین تخلیق قرار پائی۔ 'لویٹر' کا یہ خیال بعد اَزاں عظیم دھماکے کے نظریئے کی صورت میں متعارف ہوا۔ یہاں ایک چیز میں اِختلاف ہے کہ صفر درجہ جسامت کی اِکائیت پر مُشتمل وہ مادّہ کس طرح تقسیم ہوا، مادّے نے کس طرح بیرونی اَطراف میں سفر شروع کیا اور علیحدگی، اِنشقاق اور دھماکہ کس طرح شروع ہوا؟ ہم اِن تفصیلات میں جانے سے اِحتراز کریں گے۔

اصل حقیقت ہر صورت وُہی ہے کہ آج ہمیں نظر آنے والی کہکشائیں اُس اِکائی مادّے سے اِنشقاق شدہ اور علیحدہ ہیں، جس کا قرآنِ حکیم میں یوں ذِکر آتا ہے:

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا.

(الانبیاء، 21:30)

(سب) ایک اِکائی (singularity) کی شکل میں جُڑے ہوئے تھے، پس ہم نے اُنہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔

اِبتدائی دھماکے کا قرآنی نظریہ

جوں جوں بگ بینگ تھیوری کی صداقت ثابت ہو رہی ہے قرآنِ مجید کی حقانیّت بھی اَظہر من الشّمس ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تخلیقِ کائنات کے رُمرے میں قرآنِ مجید ایک قدم مزید آگے بڑھاتا ہے۔ آج کے سائنسدانوں کو یہ سوال درپیش ہے کہ کائنات میں صفر درجہ جسامت کی اِکائیت سے اِنشقاق اور وُسعت پذیری کا عمل کس طرح شروع ہوا؟ اِس سوال کا جواب قرآنِ مجید میں ہے۔ مندرجہ ذیل دو آیاتِ مبارکہ اِس موضوع پر بڑی معنی خیز ہیں:

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ O مِن شَرِّ مَا خَلَقَ (الفلق، 113: 1، 2)

آپ عرض کیجئے کہ میں (ایک) دھماکے سے اِنتہائی تیزی کے ساتھ (کائنات کو) وُجود میں لانے والے ربّ کی پناہ مانگتا ہوں O ہر اُس چیز کے شر (اور نقصان) سے جو اُس نے پیدا فرمائی ہے۔

ہمارے موضوع کی مناسبت سے اِس آیتِ کریمہ میں دو اَلفاظ ''فَلَق'' اور ''خَلَق'' بطورِ خاص قابلِ توجہ ہیں۔ لفظِ 'خَلَق' اپنے مفہوم کا مکمل آئینہ دار ہے اور واضح طور پر عملِ تخلیق کی طرف اِشارہ کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ بات بھی خاصی توجہ طلب ہے کہ لفظِ 'فَلَق' عملِ تخلیق کے ساتھ ایک گہرا اور قریبی تعلق رکھتا ہے۔ آیئے اب ہم پہلی آیتِ کریمہ میں وارِد ہونے والے لفظ 'فَلَق' کے معانی اور اہمیت کو سمجھیں۔

'ڈاکٹر ہلوک نور باقی' نے عربی گرامر کی رُو سے لفظِ ''فَلَق'' کے بہت سے معانی بیان کئے ہیں۔ تاہم اِس لفظ کا بنیادی معنی کسی چیز کا اچانک پھٹنا اور شدید دھماکہ کرنا ہے۔ یہ ''فَلَقٌ'' سے مشتق ہے۔ ایک اور تعریف کے مطابق اِس میں پھٹی ہوئی شے کا تصوّر بھی پایا جاتا ہے اور یہ وہ تصوّر ہے جو مذکورہ مظہر کو عیاں کرتا ہے۔ ''فَلَق'' ایک شدید دھماکے کا نتیجہ ہے، جو اپنے اندر اِنتہائی غیر معمولی رفتار کا تصوّر بھی رکھتا ہے۔ مِثال کے طور پر ''تَفَلُّق'' کا معنی حد درجہ رفتار کے ساتھ بھاگنا ہے۔

قرآنِ مجید صفاتِ باری تعالیٰ کے ذِکر میں فرماتا ہے: فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى. (الانعام، 6: 95)

دانے اور گٹھلی کو پھاڑ نکالنے والا۔

صَرفی پس منظر کی اِس مختصر وضاحت کے بعد اب ہم ''فَلَق'' کے لُغوِی معانی پر غور کرتے ہیں۔ لُغوِی اِعتبار سے ''فَلَق'' کے معانی کو یوں ترتیب دِیا جا سکتا ہے:

- ایک ایسی مخلوق جو عدم کے پھٹنے کی وجہ سے تیز رفتاری کے ساتھ ظاہر ہو۔
- بیج کے پھٹنے سے ظاہر ہونے والا پودا۔

- روزانہ کا وہ عمل جس کے معنی اِس تمثیل سے لئے گئے ہیں کہ روشنی پھٹے اور اندھیرے میں ظاہر ہو، جسے پَو پھٹنا کہتے ہیں تب صبحِ صادِق اور بعد ازاں طلوعِ آفتاب ہوتا ہے۔

اِس آیتِ مبارکہ کی تفسیر و توضیح میں بہت سے مفسّرین نے عام معانی کو ترجیح دی ہے۔ تاہم کچھ مفسّرین نے تمثیلی معانی صبحِ صادِق اور طلوعِ شمس وغیرہ بھی اَخذ کئے ہیں۔ بعض مفسّرین نے اِس سے مُراد جہنّم میں واقع شدید دھماکوں کا علاقہ بھی بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظِ ''فَلَق'' ایسے نتیجے یا اَشیاء کا معنی دیتا ہے جو اچانک اور شدید دھماکے سے وُقوع پذیر ہوں۔ اِس لفظ کے دُوسرے مفاہیم ثانوی حیثیت رکھتے ہیں جو تمثیلی اَنداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اِس انداز کو اپنانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج سے 14 صدیاں قبل علمِ طبیعیات (physics) اور علمِ فلکی طبیعیات (astrophysics) کے بارے میں اِنسانی شعور کی واقفیت اِس قدر نہ تھی کہ وہ ان سائنسی مفاہیم کو بعینہٖ اَخذ کر سکتا۔

جدید سائنسی تحقیقات کی رُو سے کائنات کا آغاز جس بڑے حادثے سے ہوا وہ ایک عظیم دھماکہ تھا۔ یہاں ہم عظیم دھماکے کے نظریئے (Big Bang theory) کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالنا مناسب خیال کریں گے :

1950ء کے عشرے میں 'آئن سٹائن' کے پھیلتی ہوئی کائنات کے تصور سے متاثر ہو کر 'ریلف الفر' (Ralph Alpher)، 'ہینس بیتھے' (Hans Bethe) اور 'جارج گیمو' (George Gamow) نے پہلی بار عظیم دھماکے کے نظریئے کو غور و خوض کے لئے منظرِ عام پر پیش کیا۔ یہ نظریہ سالہا سال گرما گرم بحثوں کا مرکز بنا رہا۔ دو اہم دریافتوں نے عظیم دھماکے کے نظریئے کو ثابت ہونے میں مدد دی۔

پہلی ایڈوِن ہبل کی 'کائناتی سرخ ہٹاؤ' (cosmic red shift) کی دریافت تھی، جو دُور ہٹتی ہوئی کہکشاں کے طِیف (spectrum) سے حاصل ہوئی۔ تاہم سب سے حتمی اور دوٹوک فیصلہ کن دریافت 1965ء میں ہونے والی 3 درجہ کیلون کی مائیکرو ویو پس منظر کی شعاع ریزی تھی۔ یہ شعاع ریزی اِبتدائی دھماکے کے باقی ماندہ اَثرات کی صورت میں ابھی تک پوری کائنات میں سرایت کئے ہوئے ہے اور اُس کی لہروں کا شور ریڈیائی دُوربینوں کی مدد سے بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

طبیعیات کی ایک اور اہم دریافت جس نے سائنسدانوں کو 'عظیم دھماکے کے نظریئے' کی صداقت تک پہنچنے میں مدد دی وہ 'آزاد خلا کی تباہی' کی دریافت ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ خلا ایک ایسی جگہ ہے جہاں کچھ بھی پایا نہیں جاتا، مگر تحقیقات کے بعد یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خلاء میں بھی مادّے کی کوئی نہ کوئی شکل موجود

قرآن اور نظریۂ اِضافیت (Theory of Relativity)

قرآنِ مجید میں تخلیقِ کائنات سے متعلق بے شمار آیات موجود ہیں جن کے مطالعہ سے خالقِ کائنات کی شانِ خلّاقیت عیاں ہوتی ہے۔ اللہ ربّ العزت نے اِس کائنات کی تخلیق میں ایک خاص حُسنِ نظم سے کام لیا ہے، جسے ہم اپنی اِستعداد کے سانچوں میں ڈھالتے ہوئے مختلف علوم و فنون کی اِصطلاحات کی صورت میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید کا سائنسی مطالعہ آئن سٹائن کے نظریۂ اِضافیت کے حوالے سے علمِ تخلیقیات (cosmology) اور علمِ فلکی طبیعیات (astrophysics) کے مندرجہ ذیل اُصول مہیا کرتا ہے:

1۔ رَتْق اور فَتْق کے تصوّر کے تحت قرآنِ مجید یہ بتاتا ہے کہ مادّہ اور توانائی اِبتداءً ایک ہی چیز تھے۔ مادّہ سمٹی ہوئی توانائی ہے اور توانائی مادّے کی آزاد شدہ شکل۔ اِسی طرح زمان و مکان (space & time) کو بھی ایک دُوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے، دونوں ہمیشہ مسلسل متصل حالت میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ ربُّ العزت نے اپنی ربوبیّت کی طاقت اور دباؤ کے عمل سے تمام اَجرامِ سماوِی کو ایک وحدت (singularity) سے پھاڑ کر جدا جدا کر دِیا اور یوں تمام سماوِی کائنات کو وُجود ملا۔ یہ قرآنی راز 'آئن سٹائن' کے 'نظریۂ اِضافیت' کے ذرِیعے بیسویں صدی کے اَوائل میں منظرِ عام پر آیا۔

2۔ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ (الذاریات، 51:47) کے تحت کائنات کو طاقت کے ذریعے پیدا کئے جانے سے حاصل ہونے والا قرآنی تصوّر اِس سائنسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ 'عظیم اِبتدائی دھماکے' (Big Bang) سے شروع ہونے والی کائنات کی تخلیق سے لے کر اُس کے پھیلاؤ اور موجودہ حالت تک، ایک ایٹم کے نظام سے لے کر عظیم نظامِ سیارگان اور کہکشاؤں کے بڑے بڑے گروہوں تک ہر چیز کی بقا کا اِنحصار کھنچاؤ اور توانائی کے برقرار رہنے اور اُن کے مابین توازُن پر مبنی ہے۔

یہ کھنچاؤ مرکز مائل (centripetal) اور مرکز گریز (centrifugal) قوّتوں کی صورت میں کائنات کے ہر مقام اور ہر شے میں پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں 'مرکز مائل قوّت' اور 'مرکز گریز قوّت' کا ہر جگہ برابر پایا جانا ایک ایسے توازُن کی نشاندہی کرتا ہے جو نظامِ سیارگان کے وُجود کی ضمانت ہے۔ اُن دونوں طاقتوں کے اِعتدال ہی سے ساری کائنات کا نظام قائم و دائم ہے اور ذرا سی بے اِعتدالی تمام نظامِ عالم کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔ جیسے بجلی میں مخالف بار ایک دُوسرے کو کھینچتی اور موافق بار دفع کرتی ہیں، اِسی طرح کائنات میں موجود تمام اشیاء کو۔۔۔ خواہ وہ سورج اور دُوسرے ستاروں کے گرد محوِ گردِش سیارے ہوں یا نیوکلیئس کے گرد گھومنے والے اِلیکٹران۔۔۔ 'مرکز گریز

قوّت' ہی اُنہیں 'کششِ ثقل' کے زیرِاثر مرکز میں گرنے اور مُنہدم ہونے سے بچائے ہوئے ہے۔ گویا کائنات کا تمام توازُن اللہ ربّ العزت کے نظامِ ربوبیت کے پیدا کردہ کھنچاؤ اور توانائی ہی سے منظّم ہے۔

3۔ 'آئن سٹائن' کے 'خصوصی نظریۂ اِضافیت' (Special Theory of Relativity) کے ذرِیعے قرآنِ مجید کے اِس تصوّر۔۔۔ کہ کائنات کو طاقت (توانائی) کے ذرِیعے پیدا کیا گیا ہے۔۔۔ کی واضح توثیق میسر آچکی ہے۔ اِس نظریئے کی بنیاد $E=mc^2$ مساوات ہے، یعنی توانائی ایسے مادّے پر مشتمل ہوتی ہے جسے روشنی کی سمتی رفتار (velocity) کے مربّع کے ساتھ ضرب دی گئی ہو۔ یہ تعلق اِس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مادّہ توانائی ہی کی ایک شکل ہے اور روشنی کی سمتی رفتار کے تناظر میں مادّے کے ہر ایٹم کے اندر توانائی کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ یہی وہ مساوات ہے جس نے سورج اور دُوسرے ستاروں میں توانائی کے ذرائع کی وضاحت کی اور اُسی کے ذرِیعے بعد ازاں ایٹمی توانائی اور ایٹم بم کی بنیادیں بھی فراہم ہوئیں۔

آئن سٹائن کی یہ دریافت اِس حقیقت کو عیاں کرتی ہے کہ ایٹم کی ساخت طاقت یعنی توانائی ($E=mc^2$) کے ذرِیعے وُجود میں لائی گئی ہے۔ یہ حقیقت اِن آیاتِ قرآنیہ سے کس قدر ہم آہنگ ہے:

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ (الذّاریات، 51:47)

اور ہم نے کائنات کے سماوِی طبقات کو طاقت (توانائی) کے ذرِیعے پیدا کیا اور ہم ہی اُسے وُسعت پذیر رکھتے ہیں۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان، 25:2)

اور اُسی نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے پھر اُس (کی بقاء وارتقاء کے ہر مرحلہ پر اُس کے خواص، اَفعال اور مدّت، اَلغرض ہر چیز) کو ایک مقرّرہ اندازے پر ٹھہرایا ہے۔

اِن آیاتِ کریمہ میں ہر شے کی توانائی کے ذرِیعے تخلیق، اور ہر چیز میں اور مادّے کے ہر ایٹم میں توانائی کے متناسب تسوِیہ کا تصوّر پایا جاتا ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ O وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (القمر، 54:49، 50)

ہم نے ہر شے ایک مقرّر اَندازے سے بنائی ہے اور ہمارا حکم تو یکبارگی ایسے (واقع) ہو جائے گا جیسے آنکھ کا جھپکنا۔

یہ آیاتِ مبارکہ ظاہر کرتی ہیں کہ تخلیق کا عمل ایک حکم کی تعمیل میں ہونے والا دھماکہ تھا، جس نے عمل درآمد کے لئے پلک جھپکنے سے بھی کم، ایک سیکنڈ کا بہت تھوڑا عرصہ صرف کیا اور کائنات کا ہر ذرّہ توانائی اور

خصوصیات میں مکمل تناسب رکھتا تھا۔

4۔ قرآنِ مجید اِس سائنسی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ کائنات کا تمام سماوِی مواد اِبتداءً گیسی بادلوں کی صورت میں موجود تھا۔ سورۂ حم السجدہ کی آیت نمبر 11 میں وَھِیَ دُخَانٌ (اور وہ اُس وقت گیس کے بادل تھے) کے اَلفاظ غیر مبہم طور پر دُخانی حالت کی موجودگی کو ثابت کرتے ہیں۔ پھر اُن گیسی بادلوں کے اندر اللہ ربّ العزت نے متوازن فلکیاتی نظام ترتیب دِیا، جس کے تحت اربوں کہکشائیں اور اُن کے اندر واقع کھربوں اِنفرادی نظاموں کو وُجود ملا۔ تمام کہکشائیں کائنات کے مرکز سے باہر کی جانب بیک وقت وُسعت پذیر ہیں اور ابھی تک اُن میں اِجتماعی طور پر کوئی ٹکراؤ یا عدم توازُن پیدا نہیں ہوا، جس روز اُن میں اِجتماعی سطح کا ٹکراؤ پیدا ہوا وہ اِس کائنات کے لئے قیامت کا دن ہو گا۔

کرۂ ارضی پر اِرتقائے حیات

کائنات کی وسیع و عریض ساخت میں زمین ایک اَیسے سورج کا اَدنیٰ سا سیارہ ہے جو لاکھوں کہکشاؤں کی ریل پیل میں سے ایک کہکشاں ''ملکی وے'' کے ایک کھرب ستاروں میں ایک کنارے پر واقع ہے۔

سورج نیوکلیائی اِخراج کا ایسا دیو قامت منبع ہے، جو ڈیڑھ کروڑ (1,50,00,000) سینٹی گریڈ درجۂ حرارت کے ساتھ چمک رہا ہے۔ اُس کا قطر زمین کے قطر سے 100 گنا بڑا ہے اور زیادہ تر کائنات کے ہلکے ترین عناصر ہائیڈروجن اور ہیلیئم پر مشتمل ہونے کے باوجود اُس کی کمیّت زمین سے 3 لاکھ گنا زیادہ ہے۔

کرۂ ارضی پر اِرتقائے حیات

کائنات کی وسیع و عریض ساخت میں زمین ایک اَیسے سورج کا اَدنیٰ سا سیارہ ہے جو لاکھوں کہکشاؤں کی ریل پیل میں سے ایک کہکشاں ''ملکی وے'' کے ایک کھرب ستاروں میں ایک کنارے پر واقع ہے۔

سورج نیوکلیائی اِخراج کا ایسا دیو قامت منبع ہے، جو ڈیڑھ کروڑ (1,50,00,000) سینٹی گریڈ درجۂ حرارت کے ساتھ چمک رہا ہے۔ اُس کا قطر زمین کے قطر سے 100 گنا بڑا ہے اور زیادہ تر کائنات کے ہلکے ترین عناصر ہائیڈروجن اور ہیلیئم پر مشتمل ہونے کے باوجود اُس کی کمیّت زمین سے 3 لاکھ گنا زیادہ ہے۔

ہمارا سورج ملکی وے کی دُوسری یا تیسری نسل کا نمائندہ سِتارہ ہے، جو آج سے تقریباً 4 ارب 6 کروڑ سال پیشتر اپنے سے پہلے عظیم نوتارے (supernova) کے ملبے پر مشتمل گھومتی ہوئی گیس کے بادل سے معرضِ وُجود میں آیا تھا۔ اُس گیس اور گرد و غبار کے زیادہ تر ایٹم اپنے اندر نو ساختہ ہائیڈروجن اور ہیلیئم کے کثیف گولے کی طرف اِکٹھے ہونے لگے اور یوں وہ ستارہ وُجود میں آ گیا جسے آج ہم سب سورج کے نام سے جانتے ہیں۔ اُس گھومتے ہوئے

گیسی مادّے کا باقی حصہ نوزائیدہ سورج کے گِرد چکر لگانے لگا، اور سب سے پہلے اُس مادّے سے نظامِ شمسی کے چاروں بڑے سیارے مُشتری، زُحل، یورینس اور نیپچون تشکیل پائے۔ زمین سمیت باقی تمام چھوٹے سیارے اور سیارچے کافی عرصہ بعد گرد و غبار کے باقی ماندہ ذرّات سے پیدا ہوئے۔

زمین پر زندگی کے آغاز کے پہلے باہمی اِنحصار کے اللہ ربّ العزت کے تخلیق کردہ توازُن، ہم آہنگی اور تعاونِ باہمی نے پوری کائنات میں قوانینِ فطرت کو جنم دِیا اور پروان چڑھایا، جن کے تحت تمام کہکشائیں، ستارے، سیارے اور مختلف سیاروں پر زِندگی گزارنے والی مخلوقات اپنا وُجود برقرار رکھے ہوئے ہیں اور باہمی اِنحصار کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔

کائنات کی اس شکل و صورت کو قرآنِ مجید یوں بیان کرتا ہے:

1. أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (الانبياء، 21:30)

اور کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اِکائی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے، پس ہم نے اُنہیں پھاڑ کر جدا کر دِیا، اور ہم نے (زمین پر) ہر زِندہ چیز (کی زندگی) کی نمود پانی سے کی، تو کیا وہ (اِن حقائق سے آگاہ ہو کر اَب بھی) اِیمان نہیں لاتےo

2. وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (الانبياء، 21:31)

اور ہم نے زمین میں مضبوط پہاڑ بنا دیئے تاکہ ایسا (نہ) ہو کہ کہیں (زمین اپنے مدار میں) حرکت کرتے ہوئے اُنہیں لے کر کانپنے لگے اور ہم نے اس (زمین) میں کشادہ راستے (درّے) بنائے تاکہ لوگ (مختلف منزلوں تک پہنچنے کے لئے) راہ پا سکیں-

3. وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ (الانبياء، 21:32)

اور ہم نے سمآء (یعنی زمین کے بالائی کرّوں) کو محفوظ چھت بنایا (تاکہ اہلِ زمین کو خلا سے آنے والی مُہلک قوّتوں اور جارحانہ لہروں کے مُضر اثرات سے بچائیں) اور وہ اُن (سماوِی طبقات کی) نشانیوں سے رُوگرداں ہیں-

4. وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (الانبياء، 21:33)

اور وُہی (اللہ) ہے جس نے رات اور دِن کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو (بھی)، تمام (آسمانی کرّے) اپنے اپنے مدار کے اندر تیزی سے تیرتے چلے جاتے ہیں-

5. وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (فصلت، 41: 10)

اور اُس نے اس (زمین کے) اندر بڑی برکت رکھی (قسم قسم کی کانیں اور نشو و نما کی قوتیں) اور اُس میں چار مراحل میں (زمین) میں اُس کے ذرائعِ نِعَم رکھے، جو ہر طلبگار کے لئے برابر ہیں۔

6. ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (فصلت، 41:11)

پھر وہ (اللہ تعالیٰ) آسمان کی طرف متوجہ ہوا کہ وہ (اُس وقت) دُھواں (سا) تھا۔ پھر اُسے اور زمین کو حکم دِیا کہ تم دونوں (باہمی اِنحصار کے توازُن کے لئے) خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے، اُن دونوں نے کہا کہ ہم (فطری نظام کے تحت) خوشی سے حاضر ہیں۔

7. فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (فصلت، 41: 12)

پھر دو (خاص) مراحل میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان کے اَحکام اُس میں بھیج دیئے، اور ہم نے آسمانِ دُنیا کو چراغوں سے رَونق بخشی اور اُس کو محفوظ (بھی) کر دِیا، یہ اِنتظام ہے زبردست (اور) علم والے ربّ کا۔

تخلیقِ زمین اور اُس کا فطری اِرتقاء

1. زمین اِبتدائی طور پر بے اِنتہا گرم تھی اور اِس پر کسی قسم کی فضا موجود نہ تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی اور چٹانوں سے نکلنے والی گیسوں کے اِخراج سے اُس کے چاروں طرف ہوا کا ایک غلاف چڑھ گیا۔ زمین کے اِبتدائی دَور کی فضا ہرگز اِس قابل نہ تھی کہ ہم اُس میں زِندہ رہ سکتے۔ اُس میں آکسیجن بالکل نہیں تھی بلکہ ہائیڈروجن سلفائیڈ جیسی زہریلی گیسیں تھیں۔

2. اُس وقت اللہ ربّ العزّت نے زِندگی کچھ ایسی اِبتدائی حالتوں میں پیدا کی تھی جو سمندروں میں ہی پنپ اور پروان چڑھ سکتی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس دوران ایٹموں کے ملنے کے نتیجے میں ایسی بڑی بڑی ساختیں پیدا ہونے لگ گئی ہوں گی، جنہیں 'میکرومالیکیولز (macromolecules)' کہا جاتا ہے، اور وہ امرِ باری تعالیٰ سے سمندروں میں موجود دُوسرے ایٹموں سے ایسی ہی مزید ساختیں پیدا کرنے کے قابل ہو گئے ہوں گے۔ نئے مالیکیولوں نے مزید مالیکیولز کو جنم دِیا اور یوں اللہ تعالیٰ نے زِندہ اَجسام کی خودکار اَفزائشِ نسل کو وُجود بخشا۔

3. زِندگی کی اُن اِبتدائی شکلوں نے بہت سے زہریلے مادّے تحلیل کر دیئے اور آکسیجن کو جنم دِیا۔

یوں آہستہ آہستہ فضا اُن ترکیبی عناصر میں تبدیل ہوتی چلی گئی، جو آج رُوئے زمین پر بکثرت پائے جاتے ہیں اور اُس نو ترکیب شدہ فضا نے زِندگی کی اَعلیٰ اَقسام : حشرات، مچھلیوں، ممالیہ جانوروں اور بالآخر اَشرفُ المخلوقات نسلِ اِنسانی کو ترقی پذیر ہونے کا موقع فراہم کیا، تب اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو کرۂ ارضی کی خلافت کا تاج پہنا کر مبعوث فرمایا۔

مراحلِ تخلیقِ اَرض

زمین بھی اُنہی دو مراحل میں تخلیق ہوئی جن کا ذِکر پہلے گزر چکا ہے۔ قرآنِ مجید میں اِسے زمینی تخلیق کے ضمن میں یوں بیان کیا گیا ہے :

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ (فصلت، 41 : 9)

آپ (اُن سے) پوچھئے کہ کیا تم اُس ذات کے مُنکر ہو جس نے زمین کو دو مراحل میں تخلیق کیا؟ اور (دُوسروں کو) اُس کا ہمسر ٹھہراتے ہو؟ وُہی تو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

جدید سائنسی تحقیقات کے محتاط اندازے کے مطابق زمین کی تخلیق آج سے کم و بیش 4 ارب 60 کروڑ سال پہلے گیس اور گرد و غبار کے بادل سے عمل میں آئی۔ اصل حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہی بہتر آگاہ ہے۔ یہاں ہمیں جدید سائنس قرآنِ مجید کے پیش کردہ حقائق کی بھی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔ علمِ طبقاتُ الارض (geology) کے جدوَل کے مطابق ظہورِ حیات سے پہلے کے مرحلے کو اَیزویک اِیرا (Azoic Era) کہتے ہیں۔ اُس دَور کے بارے میں یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ تقریباً 4 ارب 5 کروڑ سالوں پر محیط تھا۔ اُس زمانے میں زمین کسی بھی نوعِ حیات کے لئے قابلِ سکونت نہ تھی۔ پھر آج سے تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ سال قبل اِذنِ اِلٰہی سے زمین کے حالات کو اِبتدائی اَنواعِ حیات کے قابل بنایا گیا اور کرۂ ارضی پر حیات بیکٹیریا (bacteria) اور ایلجی (algae) کی شکل میں رُونما ہونے لگی۔ یہیں سے عملِ تخلیق کے دُوسرے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔

مرحلۂ مابعدِ ظہورِ حیات

کرۂ ارضی پر ظہورِ حیات کے بعد کا مرحلہ چار اَدوار میں منقسم ہے۔ قرآنِ مجید اِس بارے میں یوں گویا ہوتا ہے : وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (فصلت، 41 : 10)

اور اُس نے اس (زمین کے) اندر بڑی برکت رکھی (قسم قسم کی کانیں اور نشو و نما کی قوتیں) اور اُس میں چار مراحل میں (زمین) میں اُس کے ذرائعِ نعم رکھے، جو ہر طلبگار کے لئے برابر ہیں۔

یہ جان کر اِسلام پر ہمارا یقین مزید پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ جدید سائنس قرآنِ حکیم میں پیش کئے جانے

والے اوّلین ظہورِ حیات کے بعد زِندگی کے چار مراحل کی مکمل طور پر بھرپور حمایت کرتی ہے۔

سائنسی تحقیقات جن چار اَدوار کو بیان کرتی ہیں وہ یہ ہیں:

1. مرحلۂ ماقبلِ عہدِ حجری Proterozoic Era
2. مرحلۂ حیاتِ قدیم Paleozoic Era
3. مرحلۂ حیاتِ وُسطیٰ Mesozoic Era
4. مرحلۂ حیاتِ جدید Cainozoic Era

1۔ مرحلۂ ماقبلِ عہدِ حجری

اِس دَور کو Proterozoic Era کے علاوہ Precambrian Time کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ stone age سے پہلے کا دور ہے۔ اُس دوران میں زمینی زندگی چار ابتدائی آثار کی شکل میں نمودار ہوئی:

i. First Life Cells iii. Protista

ii. Monera iv. Metazoa

2۔ مرحلۂ حیاتِ قدیم

یہ دورِ قدیم کی زِندگی (ancient life) کہلاتی ہے جس کا آغاز آج سے 55,00,00,000 سال پہلے ہوا تھا۔ یہ وہ دَور ہے جب کرۂ ارضی شروع شروع میں اِس قابل ہوا کہ اُس پر زندگی کا آغاز ہو سکے، تب اللہ تعالیٰ نے زِندگی کو اُس کی سادہ ترین شکلوں میں سمندروں اور بعد ازاں خشکی پر بھی پروان چڑھانا شروع کیا۔

اس دَور کو مزید درج ذیل حصوں (periods) میں تقسیم کیا گیا ہے:

i. Cambrian Period

ii. Ordovician Period

iii. Silurian Period

iv. Devonian Period

v. Carboniferous Period

vi. Permian Period

3۔ مرحلۂ حیاتِ وُسطیٰ

یہ زندگی کا وسطانی دَور ہے، جسے middle life کہتے ہیں۔ یہ وہ دَور ہے جب کرۂ ارضی پر ہر طرف عظیمُ

الجثہ جانوروں کی فرمانروائی تھی۔ ڈائنوسار اُسی دَور میں پائے جاتے تھے۔ یہ دَور آج سے 24,80,00,000 سال پہلے شروع ہوااور 18,30,00,000 سال تک قائم رہنے کے بعد آج سے تقریباً ساڑھے چھ کروڑ سال قبل اپنے اِختتام کو پہنچا۔

اُس دَور کے درج ذیل 3 نمایاں حصے ہیں:

i. Triassic Period

ii. Jurassic Period

iii. Cretaceous Period

4۔ مرحلۂ حیاتِ جدید

زندگی کی پیچیدہ شکلوں ڈائنوسار وغیرہ کی تباہی کے بعد 'مرحلہ حیاتِ جدید' کا آغاز ہوا جسے "modern life" کہتے ہیں۔ زندگی کے اِس مرحلے کو شروع ہوئے 6,50,00,000 سال بیت چکے ہیں۔ ہمیں سائنسی تحقیقات کی بدولت سب سے زیادہ معلومات اُسی دَور کے متعلق حاصل ہو سکی ہیں۔

اِس کی تقسیم مزید درج ذیل حصوں (periods) میں یوں کی گئی ہے:

i. Paleocene Period

ii. Eocene Period

iii. Oligocene Period

iv. Miocene Period

v. Pliocene Period

vi. Pleistocene Period

vii. Holocene Period

اِن چاروں اَدوار میں رفتہ رفتہ زمین اِس قابل ہوتی چلی گئی کہ اُس پر اعلیٰ مخلوقات زندگی بسر کر سکیں۔ بیکٹیریا (Bacteria) اور ایلجی (Algae) سے شروع ہونے والے 'دورِ حیاتِ قدیم' کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِبتدائی پودوں اور سمندری مخلوقات کی تخلیق عمل میں آتی چلی گئی حتیٰ کہ 'وسطی دورِ حیات' میں ڈائنوسار جیسے عظیم الجثہ دیو قامت جانور بھی پیدا ہوئے۔ تخلیقِ ارضی سے لے کر آج کے دِن تک کرہ ارضی پر چار برفانی دَور بھی گزر چکے ہیں، جن میں سے آخری آج سے تقریباً 20,000 سال قبل رونما ہوا تھا۔ اسی اثناء میں جب زمینی

ماحول اِس قابل ہوا کہ اُس پر حضرتِ انسان زندگی بسر کر سکے تو اللہ ربّ العزت نے سیدنا آدم علیہ السلام کو خلافتِ ارضی کی خلعت سے سرفراز فرماتے ہوئے مبعوث فرمایا۔ آدم علیہ السلام کی تخلیق ''خلقِ آخر'' ہونے کے ناطے تخلیقِ خاص (special creation) ہے۔

جدید سائنسی تحقیقات کا دار و مدار اَزمنہ قدیم سے وابستہ حجری آثار (fossils) سے ہے جو کئی ملین سال کی قدامت کے حامل ہیں۔ قدیم جانوروں اور پودوں کی وہ باقیات جو پتھروں میں محفوظ ہیں اُن کے مطالعہ سے زمین پر رہنے والی قدیم مخلوقات کے ساتھ ساتھ ہمیں اِس بات کا بھی بخوبی اَندازہ ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر کس دَور میں کس قسم کے موسمی و جغرافیائی حالات رہے ہیں۔ مرنے والے اکثر جانوروں کے جسم دُوسرے جانوروں کی خوراک کی نظر ہو جاتے یا پھر گل سڑ کر ختم ہو جاتے مگر بعض دفعہ مُردہ جسم مکمل طور پر فنا ہو جانے سے قبل کسی دلدل یا ریت میں دفن ہو جاتا۔ اِرد گرد کی ریت وغیرہ سے معدنی ذرّات اُس مُردہ جسم میں شامل ہو کر اُسے سخت اور محفوظ بنا دیتے۔ اور یوں کروڑوں سال بعد آج ہم نے اُن جسموں کو پتھروں میں سے نکال کر اپنی تحقیق کا موضوع بنالیا اور اُن فوسلز کی مدد سے بے شمار قرآنی حقائق بعینہٖ ثابت ہوتے دِکھائی دے رہے ہیں۔ جوں جوں معدُومیات (fossils) پر تحقیق میں پیش رفت ہوتی جارہی ہے توں توں اللہ ربّ العزّت کی خالقیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ وہ دِن دُور نہیں جب سائنس خود اِنسان کو اللہ تعالیٰ کی دہلیز تک کھینچ لائے گی اور اِنسان پکار اُٹھے گا:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً. (آل عمران، 3: 191)

اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا۔

زمینی زندگی کا پانی سے آغاز

اِس عنصرِ تخلیق کی وضاحت بھی قرآن نے کر دی ہے۔ جس میں اِس اَمر کی صراحت ہے کہ زِندگی کا آغاز پانی سے ہوا ہے، بلکہ زیریں اور بالائی کائنات کی تخلیق کے وقت بھی ہر سو پانی ہی پانی تھا۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ. (ہود، 11: 7)

اور وُہی (اللہ) ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ اَدوار میں پیدا فرمایا اور (اُس سے قبل) اُس کا تختِ اِقتدار پانی پر تھا۔

اِس آیتِ کریمہ سے واضح طور پر پانی کا جملہ مظاہرِ حیات پر مقدّم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے (عالمِ مادّی میں صرف) پانی تھا۔

ایک اور مقام پر اِرشاد فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (الانبیاء، 21:30)

اور ہم نے (زمین پر) ہر زندہ چیز (کی زندگی) کی نمود پانی سے کی۔ کیا وہ (اِس حقیقت سے آگاہ ہو کر بھی) اِیمان نہیں لاتے؟o

اِس آیتِ قرآنی نے بہت بڑی سائنسی حقیقت (scientific fact) کو بیان کیا ہے جس کی تائید دورِ جدید کی سائنس نے آج کر دی ہے۔

تخلیقِ ارضی سے تخلیقِ حیات تک کا درمیانی زمانہ جو "Azoic Era" کہلاتا ہے اور جسے قرآن مجید نے یَوْمَیْن (two periods) سے تعبیر کیا ہے وہ زمانہ قبلِ ظہورِ حیات ہے۔ جو پانی (water) اور پہاڑوں و چٹانوں (rocks & mountains) کا زمانہ ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پہاڑوں کا وجود تو زمین کے معرضِ وُجود میں آنے کے بعد عمل میں آیا مگر پانی اس وقت سے تھا جب زمین وآسمان پر مشتمل طبیعی کائنات کی تقسیم بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔

زمین پر زندگی کے آغاز کے اِبتدائی زمانے میں بھی زندگی کے آثار اور مظاہر خشکی پر نظر نہیں آتے بلکہ صرف پانی میں نظر آتے ہیں۔ جدید سائنسی تحقیق نے اِس قرآنی امر کو ثابت کر دیا ہے کہ اُس دَور کے پہلے زمانے (Pre-Cambrian Era) میں زندگی کے جملہ مظاہر وآثار فقط سمندروں تک ہی محدُود تھے اور اُن کا خشکی پر کوئی وُجود نہ تھا۔ قدیم حیات کے دُوسرے دَور Palaeozoic Era میں بھی اِبتداءً زندگی فقط پانی تک محدُود تھی اور خشکی پر اُس کا نام ونشان تک نہ تھا۔

جدید سائنسی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ Paleozoic Era کے شروع میں Cambrian Period اور Ordovician Period کے دونوں عرصوں میں آبی حیات تو کرۂ ارضی پر موجود تھی مگر اُس عرصے میں خشکی کی زِندگی کا کوئی سراغ نہیں ملتا، لہٰذا یہ بات سائنسی تحقیق سے بھی پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ قرآنِ مجید کا اِعلان برحق ہے کہ ''ہم نے زندگی کے جملہ مظاہر کا آغاز پانی سے کیا ہے''۔ خشکی پر زندگی کا آغاز Silurian Period میں ہوا، جس میں سب سے پہلے Cooksonia نامی پودے معرضِ وُجود میں آئے۔ یہ آج سے تقریباً 43,80,00,000 سال پہلے کی بات ہے۔ یہ پودے بغیر پتوں کے تھے اور سمندروں کے کناروں پر اُگے یعنی زندگی کی پہلی علامات جو خشکی پر ظہور پذیر ہوئیں وہ بھی پانی سے ہی وجود میں آئیں جبکہ اُس وقت تک پانی میں زِندگی پودوں، کیڑوں، لاروؤں، مچھلیوں اور دِیگر چھوٹے چھوٹے جانوروں کی شکل میں کئی اِرتقائی منازِل طے کر چکی تھی۔ پھر اُس سے 3

کروڑ سال بعد اگلے عرصے Devonian Period میں زمین کے خشک حصوں پر کافی حد تک سبزہ نظر آنے لگا۔ اِسی عرصے میں درختوں کو وُجود ملا اَور اُسی آخری حصے میں خشکی پر بھی بغیر پروں کے کیڑے مکوڑے (wingless insects)، مکڑیاں (spiders) اور دیگر چھوٹے جانور ظہور پذیر ہوئے۔

اِن تاریخی شواہد پر کی جانے والی سائنسی تحقیقات سے اِس اَمر کی مکمل طور پر تصدیق ہو جاتی ہے کہ زمینی زِندگی کا آغاز پانی ہی سے ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اِبتداء سے اَب تک زمین کا غالب حصہ پانی پر ہی مشتمل ہے۔ ابھی تک زمین کا 29 فیصد حصہ خشکی پر مشتمل ہے اور باقی دو تہائی سے بھی زیادہ حصہ پانی ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۃُ الانبیاء میں آج سے صدیوں قبل جب کوئی اِن حقائق کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا اِس حقیقت کا اِعلان کرتے ہوئے سوال کیا:

أَفَلَا يُؤْمِنُونَ؟ (الأنبیاء، 21:30)

کیا وہ (اِن حقائق سے آگاہ ہو کر بھی) ایمان نہیں لاتے؟

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. قرآن میں تخلیقِ کائنات سے متعلق کن آیات کا ذکر کیا گیا ہے؟ کم از کم دو آیات تحریر کریں اور ان کی وضاحت کریں۔
2. قرآن کی روشنی میں کائنات کی تخلیق کے مراحل کیا ہیں؟ تفصیلی بیان کریں۔
3. کائنات کی تخلیق سے متعلق جدید سائنسی نظریات اور قرآنی بیانات میں کیا مطابقت پائی جاتی ہے؟ وضاحت کریں۔
4. قرآن کی روشنی میں کائنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے، اور اس سے انسان کو کیا رہنمائی ملتی ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔
5. تخلیقِ کائنات کے حوالے سے قرآنی تعلیمات انسان کے طرزِ زندگی اور فکری سوچ پر کیا اثر ڈالتی ہیں؟

یونٹ نمبر: 09

قرآن مجید اور معاملات وتدبیر منزل

جمع وترتیب: ڈاکٹر ظفر اقبال
نظر ثانی: ڈاکٹر طیب خان

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 151

یونٹ کے مقاصد 151

قرآن مجید اور تدبیر منزل و معاملات 152

تدبیر منزل اور شریعت اسلامی 152

تدبیر منزل (اصلاح خانہ) کے پانچ اُصول 153

کمانا: 154

خرچ کرنا: 154

نظام فوج داری: 154

دیوانی قانون (وصیت): 155

اہتمام تعلیم: 156

قرآن مجید کی روشنی میں معاملات یعنی لین دین کے عمومی اصول 157

باہمی رضامندی: 158

قمار اور میسر کی ممانعت: 158

ربا کا خاتمہ: 159

دھوکہ اور فریب کی ممانعت: 159

متنازع معاہدوں کی ممانعت: 160

معاہدہ کی مقاصد الشریعہ سے مطابقت و موافقت: 161

نقصان کی ذمہ داری اور منافع کی توثیق: 162

خود آزمائی 163

یونٹ کا تعارف

قرآن مجید میں معاملات اور تدبیر منزل یعنی خاندانی و گھریلو زندگی سے متعلق اہم اصول اور ضابطے بیان کیے گئے ہیں۔ قرآنی آیات کی روشنی میں یونٹ ہذا میں ان موضوعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی ان تمام آیات کو پیش کیا گیا ہے جن میں مذکورہ موضوعات سے متعلق ہدایات ملتی ہیں۔ تفاسیر اور دیگر موضوعاتی کتب سے خوب استفادہ کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ قرآنی آیات جو تدبیر منزل اور معاملات کو بیان کرتی ہیں ان کو حفظ کر سکیں۔

2۔ تدبیر منزل کے قرآنی اصولوں کو جان سکیں۔

3۔ معاملات سے متعلق قرآنی رہنمائی اور اصولوں جان سکیں۔

قرآن مجید اور تدبیر منزل و معاملات

تدبیر منزل اور شریعت اسلامی

فطرت نے انسان کے مزاج میں تہذیبی ارتقاء اور تمدنی ترقی کا جذبہ رکھا ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو اپنے معاملات کو بہتر سے بہتر نہ کرنا چاہتا ہو۔ خاندان کا ادارہ انسان کی تہذیب اور تمدنی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے نہ صرف ازدواجی زندگی اور نکاح کو سنت قرار دیا ہے، بلکہ نکاح کی ترغیب بھی دلائی ہے۔

اکابر اسلام میں بہت سے حضرات نے لکھا ہے کہ ازدواجی زندگی دینی معاملات میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو زندگی کے تمام پہلوؤں سے ازدواجی زندگی کا تعلق ہے۔ جب انسان ازدواجی زندگی اختیار کرتا ہے تو گویا وہ عبادات میں حصہ دار ہوتا ہے، عادات میں نئی زندگی اپناتا ہے اور معاملات کی ایک نئی قسم میں داخل ہوتا ہے، کیونکہ عقد نکاح میں عبادات کا پہلو بھی ہے، عادات کا پہلو بھی اور معاملات کا پہلو بھی ہے۔

خاندانی زندگی کے بارے میں شریعت کی ہدایات شادی کے پہلے مرحلے سے شروع ہو جاتی ہیں۔ رشتہ اور شادی کے بارے میں جو ہدایات قرآن پاک اور سنت رسول میں موجود ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت کا بنیادی مقصد ازدواجی تعلقات کو دیرپا اور نتیجہ خیز بنانا ہے۔

شریعت جہاں مردوں کی عزت و آبرو کی خواہاں ہے وہاں خواتین کی عزت و آبرو کی اور زیادہ خواہاں ہے، اس لیے کہ خواتین کی عزت و آبرو پر پورے معاشرے کی عزت و آبرو کا دارومدار ہے۔ خاتون خانہ کی عزت اور تکریم کی خاطر شریعت نے مہر کو لازمی قرار دیا ہے۔ شریعت میں عقد نکاح خاتون خانہ کی کرامت اور احترام کی بنیاد پر قائم ہے۔

شریعت نے جہاں تدبیر خاندان کا حکم دیا ہے، تدبیر منزل کا حکم دیا ہے وہاں تدمیر خاندان -یعنی خاندان کی تباہی و بربادی سے روکا بھی ہے۔ شادی کوئی لین دین نہیں ہے۔ اس کی اساس ہی شریعت نے محبت اور رحمت کو قرار دیا ہے اور سکون اور اطمینان کو اس کا بنیادی ہدف قرار دیا ہے۔ نکاح کے مقاصد تبھی پورے ہو سکتے ہیں جب ان کی اساس اخلاق اور حیا کے تصورات پر ہو، قانون کی حدود کے مطابق ہوں اور مروت اور حسن کردار کا اظہار ہو رہا ہو۔

قرآن مجید نے شوہر اور بیوی کے تعلق کو سکون کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا ۔ سکون اور اطمینان بنیادی طور پر روحانی اور نفسیاتی چیز ہے، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپس میں حسن اخلاق اور حسن کردار کے ساتھ زندگی بسر کی جائے۔ فریقین کو ایک دوسرے کی عام سی بات جو ناگوار لگے، نظر انداز کر دینی

چاہئیے۔ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے مثبت پہلوؤں پر نظر رکھیں اور منفی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیں تو ثمرات نکاح اور برکات ازدواج پورے طور پر سامنے آسکتے ہیں۔

اسلام نے شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کا سبق دیا ہے۔ اسلام نے یہ نہیں سکھایا کہ شوہر اپنے حقوق کے لیے ڈنڈا لے کر کھڑا ہو جائے، اور بیوی اپنے حقوق کا پرچم لیے شوہر کے سامنے صف آراء ہو جائے۔ اس صف آرائی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں متحارب کیمپوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور جیسے جیسے مطالبات بڑھتے ہیں، دوری بڑھتی جاتی ہے۔ یوں مطالبات کا یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔

اگر تربیت شریعت اور سنت کے مطابق ہو کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی تکمیل کریں اپنی اپنی ذمہ داریوں پر توجہ مرکوز رکھیں اور انہیں پورا کریں تو ماحول پر سکون رہ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ہر کوئی اپنے اپنے فرائض ادا کرتا رہے تو سب کو حقوق خود بخود مل جائیں گے۔ اس سے معاشرے میں قربت، بھائی چارہ، محبت اور الفت پیدا ہو گی۔ ادارہ خاندان کے بارے میں یہی شریعت کا مزاج اور منشا ہے۔ اور یہ سب مسائل اسی وقت حل ہو سکتے ہیں جب اخلاق اور شریعت کی حدود کی پابندی کی جائے، جس کا جو حق بنتا ہو وہ اس کو دیا جائے، جس کی جو امانت ہے وہ ادا کر دی جائے۔

نبی کریم ﷺ کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب نکاح کا خطبہ ارشاد فرماتے تو اس میں زوجین کو جو سب سے اہم تلقین کرتے وہ تقوی کے بارے میں ہوتی تھی۔ نکاح کے خطبہ مسنونہ میں پانچ مرتبہ تقوی کی تلقین آئی ہے۔ اس لیے فریقین کو خوف خدا کی تاکید کرنا اور اللہ کے حضور جواب دہی کا احساس دلانا ہی کامیاب ازدواجی زندگی کی سب سے اولین اور سب سے کامیاب کلید ہے۔

تدبیر منزل (اصلاح خانہ) کے پانچ اُصول

افراد کی ترکیب یعنی شادی بیاہ سے گھرانہ وجود میں آتا ہے، چند گھر مل کر خاندان اور برادریاں تشکیل پاتی ہیں اور بہت سی برادریوں سے ملک تشکیل پاتا ہے۔ آدمی جب صاحب خانہ بنتا ہے تو اسے کسب معاش کی ضرورت پیش آتی ہے، پھر کمائی کے خرچ کرنے کے مصارف بھی متعین کرنا ہوتے ہیں، آپس کے اختلافات کی صورت میں فیصلوں کی نوبت بھی آتی ہے، تربیت ازواج واولاد کے لیے تعلیم کا انتظام بھی ضروری ہوتا ہے، اس لیے قرآن کریم نے گھرانہ کی اصلاح کے قوانین بھی مرحمت فرمائے۔ گھر چلانے کی تدبیر اور گھرانہ کی اصلاح کو تدبیر منزل کہا جاتا ہے، قرآن کریم نے تدبیر منزل کے پانچ اصول کی جانب اشارہ کیا ہے۔

کمانا، خرچ کرنا، دیوانی قوانین، فوج داری قوانین، مضبوط نظام تعلیم۔آیئے ان کی کچھ تشریح کر لیتے ہیں۔

1. کمانا:

حصول رزق کسی بھی گھرانے کے سربراہ کی بنیادی ذمہ داری ہے، گھر کا نظام کمائی کے بغیر چلانا ممکن نہیں، کمائی کے ذرائع کی جانب سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 144 میں اشارے موجود ہیں۔ کمانے کے لیے عقل کا استعمال کار گر ہے۔ قدرت کی جانب سے کسبِ معاش کے لیے مختلف ذرائع موجود ہیں، قدرتی ذرائع اور خزانوں سے عقل و سمجھ کے استعمال سے مکمل فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، مثلاً لکڑی وافر مقدار میں میسر ہے تو اسے کاٹ کر کشتیاں بنائی جائیں، ان کشتیوں کو تجارت کا ذریعہ بنایا جائے، اسی طرح زمین عطیہ خداوندی ہے اور بارش و پانی رحمت خداوندی ہے۔انسان زمین میں بیج ڈالیں، بارش کا پانی زمین کو سیراب کرے گا یا پانی سے خود سیراب کریں۔ اللہ تعالیٰ اناج وغلہ فراہم کردیں گے، ایسے ہی لوہا، پٹرول، تانبا، آگ، گیس، لکڑی سب اللہ کی عطاء کردہ نعمتیں موجود ہیں، ان چیزوں کو جوڑ کر گاڑیاں، بسس، ٹرین، جہاز تیار کر کے روزی کما سکتے ہیں، جانور بھی حصول رزق کا ذریعہ ہیں، انہیں حصول رزق میں استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ حصول رزق کے یہ تمام ذرائع حق تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے ان انعامات سے بندہ لطف اندوز ہوتا ہے، وہی خالق ومالک اور رازق ہے، اس کے انعامات کا تقاضا ہے کہ اس سے قلبی لگاؤ اور حقیقی محبت کی جائے، اسی کو معبودِ برحق سمجھا جائے۔

2. خرچ کرنا:

جو چیز ہم خود تناول یا کسی کو کھلا رہے ہیں تو وہ حلال ہونا ضروری ہے، حرام چیز کا کھانا یا کھلانا ممنوع ہے، اشیاء کو حلال وحرام بنانے والی ذات بھی ذاتِ واحد حق تعالیٰ شانہ کی ہے، وہی ہر چیز کا خالق ومالک ہے، جو اشیاء اس نے انسان کے لیے مفید بنائیں انہیں حلال کر دیا اور جو انسان کے لیے غیر مفید تھیں انہیں حرام کر دیا، بعض اشیاء انسان کے لیے اس لیے غیر مفید ہیں کہ ان کے استعمال سے خود انسان کی عظمت و کرامت متاثر ہوتی ہے، مثلاً انسانی گوشت اور بعض اس لیے غیر مفید اور حرام ہیں کہ ان میں خباثت، نجاست یا گندگی پائی جاتی ہے، مثلاً ذبح کے وقت نکلنے والا خون، مردار یا خنزیر یا معنوی نجاست وخباثت کی وجہ سے ممنوع کردہ اشیاء، مثلاً غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جانور... تو ان سب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

3. نظام فوج داری:

قرآن میں ظلم کو روکنے اور توڑنے کے لیے نظام فوج داری کے دیت وقصاص کا ابدی وسرمدی اصول بیان

کیا گیا ہے، اس اصول کی بدولت ظالم بھی مظلوم ہی کی طرح ٹھہرتا ہے، جو سلوک مظلوم کے ساتھ ہوا وہی یا اس جیسا سلوک ظالم کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس قانون قصاص کی حکمت یہ ہے کہ مظلوم و مقتول یا اس کے وارثان کا غیظ وغضب، جذبہ انتقام اور غصہ کی آگ قصاص کی بدولت فرو ہو جاتی ہے اور وہ معاشرہ میں قانون شکنی کی جرات نہیں کر پاتے، بصورتِ دیگر وارثان مقتول آتش انتقام میں قانون شکنی کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنے مخالفین کو بھسم کر ڈالنے کی سعی کرتے ہیں، جس کا مشاہدہ ہم روز کیا کرتے ہیں، اس قانون قصاص کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ جب ایک قاتل وظالم اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو تمام لوگ اس کے عبرت ناک انجام کی بدولت اس جرم بد سے دور رہتے ہیں، بڑے سے بڑا مجرم بھی آسانی سے اس جرم کے ارتکاب کی جسارت نہیں کر پاتا، یہی وجہ ہے کہ ماضی قریب یا بعید میں جن پاکیزہ معاشروں میں اسلام کا یہ خوب صورت قانون اپنی اصلی شکل میں رائج رہا وہاں کرائم وجرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر رہی۔

4. دیوانی قانون (وصیت):

قرآن کریم نے تدبیر منزل (گھریلو نظام کی اصلاح وتدبیر) کے لیے دیوانی قوانین بھی مختلف مقامات پر تفصیل سے بیان فرمائے، چناں چہ نکاح، طلاق، خلع، ایلاء، عدت، رضاعت، حقوق ازواج، نان، نفقہ، خرید وفروخت کے قوانین، سود، جوا، رہن، امانت، وصیت، وراثت، شہادت اور قسم وغیرہ کے ضابطہ دیوانی کی دفعات تفصیل سے بیان کی ہیں۔ اکثر مفسرین کی تحقیق کے مطابق وراثت کے احکام مقرر ہونے سے قبل یہ حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو مرحمت فرمایا گیا کہ وفات کے وقت اگر مال موجود ہو تو قریب المرگ شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لیے اپنے مال کے مناسب حصہ کی وصیت کرے کہ اتنا میرے والد، اتنا میری والدہ اور اتنا حصہ میری اولاد اور اتنا فلاں فلاں رشتہ دار کو دے دیا جائے، یہ وصیت کرنا شروع اسلام میں واجب تھا اور اس وصیت کی تعمیل ورثاء پر لازم تھی، وصیت سننے والوں اور گواہوں پر لازم تھا کہ وہ وصیت کو من وعن نافذ کریں، اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کریں، تبدیلی سخت گناہ اور باعث مواخذہ تھی اور آج بھی وصیت کے سلسلہ میں یہی حکم ہے کہ شریعت کے مطابق کی گئی وصیت کو قطعاً نہ بدلا جائے اور حتی الامکان اسے پورا کیا جائے، البتہ وصیت کرنے والا اگر وصیت میں دانستہ یا بھول کر غلطی کر رہا ہو تو وصیت کرنے والے کی وصیت کرتے وقت شرعی اصولوں کے مطابق اصلاح کی جاسکتی ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر وصیت کرنے والے کو سمجھایا جائے تو اسے بھی اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔

5. اہتمام تعلیم:

باری تعالیٰ نے گھرانہ کے نظام کی تدبیر واصلاح کے لیے درج بالا جو پانچ راہ نما اصول بیان کیے ہیں ان میں سے ایک تعلیم کا اہتمام وانتظام کرنا بھی ہے، تاکہ گھرانہ نور علم سے منور ہو کر ہمہ قسم کی ضلالتوں وجہالتوں سے اپنے آپ کو بچا کر کے دنیوی واخروی نقصانات سے محفوظ رہ سکے۔

تعلیم کے لیے چند اساسی ارکان ہیں:

نصاب تعلیم، وقت تعلیم، طریقہ تعلیم۔

نصاب تعلیم تو قرآن کریم ہے، سرچشمہ علم و عمل ہے، جملہ علوم وفنون قرآن کریم سے ہی پھوٹتے ہیں، قرآن کریم سے ہی نظام حیات طے کیا جاسکتا ہے، انسان کی ابتدا سے لے کر انتہا تک، گزشتہ امتوں کی تاریخ سے لے کر آنے والے جہاں کی خبروں تک، انفرادی زندگی سے لے کر قوموں کی حیات تک، فرد کی اصلاح سے لے کر قوموں کی راہ نمائی تک، جہاں داری، جہاں بانی، عقائد، عبادات، اخلاق وآداب، معاملات، اصولِ تقویٰ، عدل وانصاف، مساوات، اخوت، اقوام عالم سے برتاؤ، دنیا کے حالات، آخرت کے معاملات، جرم اور ان کی سزائیں سبھی کچھ قرآن کریم میں موجود ہیں، انسانی ضرورت کا کوئی نصاب تعلیم قرآن کریم کو شامل کیے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتا۔

"وقت تعلیم" تو پوری زندگی اور زندگی کے تمام ماہ وسال ہیں، لیکن رمضان المبارک کو قرآن کریم سے خاص تعلق ونسبت حاصل ہے، چناں چہ اکثر کتب وصحائف کا نزول بھی رمضان المبارک میں ہوا اور خود قرآن کریم بھی رمضان المبارک میں اترا، اس لیے ماہ صیام کو خصوصیت سے تعلیم قرآن کے لیے موزوں کہاں جاسکتا ہے، حالت صیام وقیام میں تقرب الی اللہ اور فہم قرآن کی استعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے، اس لیے یہ مبارک مہینہ تلاوت، سماعت، فہم وتدبر اور تلاوتِ قرآن کے لیے نہایت موزوں ہے۔

"طریق تعلیم" اسلوب نبوی سے متعین ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرز وانداز سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تعلیم قرآن کریم کے زیور سے آراستہ فرمایا وہ امت کے لیے کام یابی وکام رانی کا باعث ہے، آپ نے تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ کا اہتمام بھی فرمایا، گویا کہ آپ کے طریقہ تعلیم میں چار چیزیں شامل تھیں۔

..*الفاظ قرآن کریم کی تلاوت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت فرماتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ان الفاظ کو دہراتے اور یاد فرماتے اور

شب و روز اس کی تلاوت میں مصروف رہتے۔

..*معانی قرآن کریم سے آگاہی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کے معانی و مطالب بھی سکھائے، اس لیے قرآن کے مفہوم کو اپنی رائے اور پسند سے متعین کرنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس عمل کو "تفسیر بالرائے" قرار دے کر اس کی مذمت کی گئی، حقیقت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے قرآنی الفاظ بھی خود مرحمت فرمائے اور مطالب قرآنی بھی القاء کیے، یہی مطالب و مفاہیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو سکھلائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے تلامذہ کو، یوں الفاظ قرآنی کے ساتھ ساتھ معانی قرآن بھی پوری امت اور قیامت تک کے مسلمانوں تک پہنچتے چلے جائیں گے۔

..*تعلیم حکمت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم معانی قرآن کے ساتھ ساتھ "تفسیر قرآن" حدیث کی شکل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرماتے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسے یاد کرتے جیسا کہ وہ قرآن کریم کو یاد کیا کرتے تھے، یوں ذخیرہ احادیث بھی ذخیرۂ قرآن کی طرح امت کی راہ نمائی کا باعث بن کر محفوظ علم کی شکل اختیار کر گیا۔

..*اخلاقی تربیت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف الفاظ قرآن و معانی و تفسیر قرآن کریم پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ احکام الٰہی کو دلوں میں اتارتے اور عملی طور پر تربیت بھی فرماتے تھے، چناں چہ یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہی ہے کہ وہ علم کو برائے معلومات نہیں، بلکہ برائے عمل پڑھاتا ہے، چناں چہ جوں جوں علم بڑھتا چلا گیا ویسے ویسے ہی تربیت و عمل میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کی سب سے غیر طاقت ور قوم پورے عالم کی قیادت کا جھنڈا لے کر اٹھی اور دنیا کو جہاں بانی کے نئے انداز واطوار دکھا کر تحسین وداد وصول کی۔ مذکورہ بالا علوم کے علاوہ قرآن کریم نے دنیوی زندگی میں معاون فنون کی جانب بھی اشارے کیے ہیں، ان کا حصول بھی نہایت اہم ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں معاملات یعنی لین دین کے عمومی اصول

انسان اپنے معاشرتی معاملات میں ایک دوسرے سے لین دین کس طریق سے بخوبی نبھا سکتا ہے اور معاملات کی پابندی انسان کو ایک اچھا شہری، ایک اچھا فرد بننے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ قرآن مجید و سنت مبارکہ کی عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ عبادات کو تفصیل میں جبکہ معاشرتی معاملات یعنی لین دین کو عام اصطلاحات و مسلمہ اصولوں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

بالفاظ دیگر معاملات کے لئے مسلمہ اصول واضح کئے گئے ہیں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے حالات و واقعات

کے مطابق قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ شریعت نے معاملات کو اصولوں کی روشنی میں اس لئے بیان کیا تاکہ مختلف لوگ، مختلف جگہوں سے اور مختلف وقت میں اس سے راہنمائی حاصل کر سکیں۔جس کی وجہ شریعت محمدی (ﷺ) کی جامعیت اور عالمگیریت ہے۔ قرآن پاک میں لین دین کے معاملات کو طے کرنے کے لئے کچھ اسلامی اصول بیان کیے گئے ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر درج ذیل میں کیا جارہا ہے:

باہمی رضامندی

لین دین میں باہمی رضا مندی پہلا اصول ہے جس کا مطلب اسلامی قوانین میں دونوں فریقن کا آزادانہ طور پر بغیر کسی خوف و ڈر کے رضا مند ہونا ہے۔ کسی لین دین کے معاہدے کی توثیق کے لئے ضروری ہے کہ دونوں فریقین باہمی طور پر رضا مند ہوں۔ ایسا معاہدہ جس میں جبر، دھوکہ، غلط بیانی اور دوسرے غیر قانونی عناصر شامل ہوں؛ ایسے معاہدے کو شریعت باطل قرار دیتی ہے۔ اس کو باطل کرنے کی علت پارٹیز کی باہمی رضا مندی اور معاہدے میں شامل ہونے کا ارادہ نہ ہونا ہے کیونکہ جبر، دھوکہ، غلط بیانی جیسے عوامل سے باہمی رضا مندی اور ارادہ باقی نہیں رہتے۔ باہمی رضا مندی کو قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا'' (النساء:29)

''اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو اور اپنی جانوں کو مت ہلاک کرو، بے شک اللہ تم پر مہربان ہے۔''

اسی طرح حضور نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا:

''فروخت کا معاہدہ صرف باہمی رضامندی سے درست ہے'' (سنن ابن ماجہ)

قمار اور میسر کی ممانعت

قمار اور میسر سے بچاؤ بھی اسلامی اصولوں میں ایک بہت اہمیت کا حامل اصول ہے۔ اسلام نے جوا کی تمام صورتوں کو سختی سے منع کیا ہے اسلام میں میسر اور قمار جوا کی ایسی اقسام ہیں جو مکمل طور پر ممنوع ہیں۔

میسر سے مراد بغیر کوئی مشقت اور ذرائع آمدن استعمال کیے، یعنی دوسروں کو حق سے محروم کرتے ہوئے دولت کو اکٹھا کرنا۔ مطلب بہت آسانی سے منافع حاصل کرنا۔ مثال کے طور پر لاٹری کا پیسہ، پانسے سے کھیلنا اور بازی

یا شرط لگانا میسر کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ قمار وہ آمدنی، منافع یا حصول منافع پر مشتمل ہے جس کا مکمل انحصار قسمت اور موقع پر ہو۔ قرآن مجید نے ان سے بچنے کی تنبیہ فرمائی ہے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ: 90)

''اے ایمان والو! بے شک شراب اور جوا اور (عبادت کے لیے) نصب کیے گئے بُت اور (قسمت معلوم کرنے کے لیے) فال کے تیر (سب) ناپاک شیطانی کام ہیں۔ سو تم ان سے (کلیتًا) پرہیز کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔''

ربا کا خاتمہ

عصر حاضر میں اسلامی قانون کا تصورِ ربا بالعموم اور اسلامی بینکنگ کے آغاز سے بالخصوص ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ ربا کے لغوی معنی زیادتی، بڑھوتی اور بلندی کے ہیں۔ اسکالر نبیل صالح کے مطابق اصل رقم میں ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے درمیان ایک غیر قانونی اضافہ ربا کہلاتا ہے۔ ربا کی ممانعت قرآن و احادیث میں بہت سے جگہوں پر فرمائی گئی ہے:

''وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' (البقرۃ: 275)

''اور اللہ نے تجارت (سوداگری) کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔''

مزید فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ'' (البقرۃ: 278-279)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ بھی سود میں سے باقی رہ گیا ہے چھوڑ دو اگر تم (صدقِ دل سے) ایمان رکھتے ہو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے اعلانِ جنگ پر خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال (جائز) ہیں، نہ تم خود ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

دھوکہ اور فریب کی ممانعت

خیلابہ اور غش بھی اسلامی اصولوں میں فریب اور دھوکہ دہی کے معنوں میں آتے ہیں۔ قرآن اور سنت نے دھوکہ دہی اور جھوٹ سے منع کیا ہے۔ خلابہ، غش اور تطفیف کے الفاظ قرآن مجید میں دھوکہ دہی کے معنوں میں

استعمال ہوئے ہیں۔اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ فروخت کی جانے والی چیز کی خرابی کو چھپانا۔دھوکہ کے کاموں میں نام تول کی کمی کو (تطفیف)، ایک چیز کی قیمت بڑھانے کیلئے غلط بولی لگانا (نجش)، ایک دودھ دینے والے جانور کی پیداوار کو خریدار کے سامنے غلط بیان کرنا (تسریعہ) کہا گیا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ oالَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ oوَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْوَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ oاَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ oلِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (المطففین: 1-5)

''بربادی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے۔یہ لوگ جب (دوسرے) لوگوں سے ناپ لیتے ہیں تو (ان سے) پورا لیتے ہیں اور جب انہیں (خود) ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔کیا یہ لوگ اس بات کا یقین نہیں رکھتے کہ وہ (مرنے کے بعد دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔ایک بڑے سخت دن کے لیے۔''

ان آیات مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ ناپ تول کرنے والے پر کتنی بڑی وعید ہے۔

حضور نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:

''اگر دونوں نے سچ بولا اور چیز کی خرابی کو پہلے بیان کیا پھر وہ اپنے لین دین میں برکت پائیں گے اور اگر انہوں نے جھوٹ بولا اور کچھ چھپایا تو وہ لین دین کی برکت کو کھو دیں گے۔'' (صحیح بخاری)

آپ (ﷺ) نے مزید ارشاد فرمایا:

''ایماندار اور سچا دکاندار قیامت کے دن اللہ کے نبی، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوگا'' (سنن ابن ماجہ)

متنازع معاہدوں کی ممانعت

متنازع معاہدوں سے متعلق قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ'' (البقرۃ: 278)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر مسلمان ہو۔''

قرآن پاک کی طرح حدیث مبارکہ میں بھی متنازع معاہدوں کو بھی بہت سختی سے منع کیا گیا ہے۔جیسا کہ حدیث نبوی (ﷺ) ہے:

''حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم (ﷺ) نے ایک فروخت میں دو فروختوں سے منع فرمایا'' (سنن ابن ماجہ)۔

اس حدیث کی روشنی میں مندرجہ ذیل چند استدلال کئے جا سکتے ہیں: مثلاً:

1. ایک شخص دوسرے شخص کو کہتا ہے کہ ''اگر میں تمہیں فلاں قیمت پر یہ چیز فروخت کر دوں تو اس کے بدلے اُس قیمت پر تم اپنا گھر مجھے بیچ دو گے۔''
2. معاہدہ تب دوسرے معاہدہ پر متنازع بنتا ہے جب دونوں باہمی طور پر متضاد معاہدے ہوں۔ مثلاً زید اپنے دوست بکر کو کہتا ہے کہ میں تمہیں تب اپنا گھر بیچوں گا جب تیسرا دوست قمر مجھے اپنا گھر بیچے گا۔ یعنی ایک معاہدہ دوسرے پر منحصر ہو۔
3. زید اپنے دوست بکر کو کہتا ہے کہ میں یہ چیز تمہیں ایک سو روپے نقد اور اگر ادھار چاہیے تو ایک سو پچاس کی بیچوں گا۔ اس طرح ایک چیز کی فروخت میں دو مختلف چیزوں کا آجانا بالکل غلط ہے۔

معاہدہ کی مقاصد الشریعہ سے مطابقت و موافقت

مقاصد الشریعہ بھی اسلامی اصولوں میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یعنی شریعہ کے کیا مقاصد ہیں؟ جن کی پیروی کرنا ہم پر فرض ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ شریعہ کا مقصد انسانی پانچ چیزوں کی حفاظت ہے: ''دین، نفس، نسل، عقل اور مال کی حفاظت''۔ کوئی بھی معاہدہ مندرجہ بالا مقاصد کے خلاف ہو تو وہ شریعت کی روشنی میں مسترد قرار دیا جاتا ہے۔ مقاصد الشریعہ کو اسلامی قانون میں حقوق اللہ کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ مقاصد الشریعہ پر قرآن پاک اور احادیث میں بہت زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت کا فرمانِ ذیشان ہے:

''مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ'' (المائدہ: 32)

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر (نازل کی گئی تورات میں یہ حکم) لکھ دیا (تھا) کہ جس نے کسی شخص کو بغیر قصاص کے یا زمین میں فساد (پھیلانے کی سزا) کے (بغیر، ناحق) قتل کر دیا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا اور جس نے اسے (ناحق مرنے سے بچا کر) زندہ رکھا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو زندہ رکھا اور بے شک ان کے پاس ہمارے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے پھر (بھی) اس کے بعد ان میں سے اکثر لوگ یقیناً زمین میں حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔''

مزید انسانی جان کی عظمت کو یوں فرمایا گیا ہے:

''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' (البقرۃ: 179)

''اور تمہارے لیے قصاص (یعنی خون کا بدلہ لینے) میں ہی زندگی (کی ضمانت) ہے اے عقلمند لوگو! تاکہ تم (خونریزی اور بربادی سے) بچو۔''

مقاصدِ شریعہ کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے:

''یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ '' (النساء:29)

''اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ۔''

نقصان کی ذمہ داری اور منافع کی توثیق

اسلام میں تجارت اور لین دین کی مکمل اجازت ہے، زندگی کے ہر پہلو کے متعلق آگاہی، بہترین تجارت اور لین دین کا طریقہ ہے۔اسلام نے ہر فرد کو واضح احکام میں بتایا کہ منافع کیسے حاصل کیا جائے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

''لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ''(آلِ عمران:186)

''بے شک ضرور تمہاری آزمائش ہو گی تمہارے مال اور تمہاری جانوں میں۔''

ہر ٹرانزکشن میں یہ اصول واضح ہونا چاہیے کہ ایک شخص اس صورت میں فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے جس میں اس کو نقصان کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

یہ اصول خرید وفروخت کے لین دین اور شراکت داری میں استعمال ہو رہا ہے۔ایک کاروباری آدمی نفع تب ہی کماتا ہے جب وہ نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہو۔ بالکل اسی طرح ایک مکان مالک اس گھر کا کرایہ لینے کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ اس نے اس مکان سے متعلق نقصانات کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ خطرہ اس کو اس کرایے کا صحیح حقدار بناتا ہے جو وہ وصول کرتا ہے۔ شراکت داری میں بھی تمام جمع کیا گیا منافع اصول ذمہ داری کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔

خود آزمائی

نیچے دیے گئے سوالات کے جوابات لکھ کر اپنے مطالعے کا جائزہ لیں:

1. قرآن میں تدبیرِ منزل سے متعلق کن آیات کا ذکر کیا گیا ہے؟ کم از کم دو آیات تحریر کریں اور ان کی وضاحت کریں۔
2. قرآن کی روشنی میں تدبیرِ منزل (گھر کے انتظام) کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ تفصیل سے بیان کریں۔
3. معاملات میں دیانت داری اور انصاف سے متعلق قرآنی رہنمائی کیا ہے؟ کسی ایک آیت کے حوالے سے وضاحت کریں۔
4. قرآنی اصولوں کی روشنی میں مالی اور سماجی معاملات کو بہتر بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں؟
5. قرآنی تعلیمات کس طرح ایک منظّم، خوشحال اور پرامن گھریلو اور معاشرتی زندگی گزارنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں؟ تفصیلی جواب دیں۔